درس ۱۱

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب

بندۂ مؤمن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

☆

مقرر و مدرس
ڈاکٹر اسرار احمد

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔کے،ماڈل ٹاؤن لاہور فون:03-5869501

نام کتاب ——— بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال (درس ۱۱)

طبع اوّل (ستمبر 1999ء) ——— 2200

طبع دوم (جنوری 2005ء) ——— 2200

ناشر ——— ناظم نشرواشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ——— 36۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 03-5869501

مطبع ——— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ——— 10 روپے

درس ۱۱

بندۂ مومن کی شخصیت کے خدوخال

سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی روشنی میں

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ○ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ○ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ○ وَالَّذِیْنَ یَبِیْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِیَامًا ○ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ○ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ○ وَالَّذِیْنَ اِذَا اَنْفَقُوْا لَمْ یُسْرِفُوْا وَلَمْ یَقْتُرُوْا وَكَانَ بَیْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ○ وَالَّذِیْنَ لَا یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا یَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ○ یُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَیَخْلُدْ فِیْهٖ مُهَانًا ○ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ یُبَدِّلُ اللّٰهُ سَیِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ○ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ○ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ○ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ○ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ○ اُولٰٓئِكَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَیُلَقَّوْنَ فِیْهَا تَحِیَّةً وَّسَلٰمًا ○ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ حَسُنَتْ

مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًاO قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّيْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ، فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًاO ﴾ (الفرقان : ۶۱ - ۷۷)

"بہت ہی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے آسمان میں بُرج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا۔ اور وہی ہے کہ جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا (اس میں نشانیاں ہیں) ہر اس شخص کے لئے جو یاد دہانی اخذ کرنا چاہے یا شکر کی روش اختیار کرنا چاہے۔ اور رحمان کے محبوب بندے تو وہ ہیں جو زمین پر چلتے ہیں تواضع اور نرمی کے ساتھ اور جب ان سے جاہل لوگ الجھتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر علیحدہ ہو جاتے ہیں اور وہ جو راتیں بسر کرتے ہیں اپنے رب کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں اے رب ہمارے! پھیر دے ہم سے جہنم کے عذاب کو۔ یقیناً اس کا عذاب چمٹ جانے والی چیز ہے۔ یقیناً وہ بہت بُری جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی اور عارضی قیام گاہ کے اعتبار سے بھی۔ اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی سے کام لیتے ہیں نہ بخل سے' بلکہ ان کی روش اس کے بین بین ہوتی ہے۔ اور وہ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو' اور نہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور نہ زنا کرتے ہیں ــــ اور جو کوئی بھی یہ کرے گا وہ اس کی پاداش بھگت کر رہے گا۔ دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن اور وہ اس میں رہے گا ہمیشہ ہمیشہ ذلیل و خوار ہو کر۔ سوائے اس کے جو توبہ کرے اور ایمان لائے اور اچھے عمل کرے' تو ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ تعالیٰ بھلائیوں سے بدل دے گا۔ اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے تو حقیقتاً وہی ہے جو ایسی توبہ کرتا ہے جیسے کہ توبہ کرنے کا حق ہے ــــ اور وہ جو جھوٹ پر اپنی موجودگی تک گوارا نہیں کرتے اور اگر کسی لغو کام کے پاس سے ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے تو بھی دامن کو بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اور وہ جنہیں جب ان کے رب کی آیات کے ذریعہ نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر نہیں ٹوٹ پڑتے۔ اور وہ جو یہ کہتے ہیں کہ اے رب ہمارے! ہمیں اپنی بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا

فرما اور ہمیں اپنے نیک بندوں کے آگے چلنے والا بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ جنہیں بدلہ میں بالا خانے ملیں گے بعوض اس صبر کے جو انہوں نے کیا' اور وہاں ان کا استقبال ہو گا نیک دعاؤں اور سلام کے ساتھ۔ وہ اس میں رہیں گے ہمیشہ ہمیش' اور وہ بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل جائے قرار ہونے کی حیثیت سے بھی اور عارضی قیام گاہ ہونے کے اعتبار سے بھی۔ اے نبی! کہہ دیجئے : میرے رب کو تمہاری کوئی پرواہ نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہیں پکارنا۔ پس تم نے جھٹلا دیا ہے تو اب یہ جھوٹ جلد تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔"

مطالعہ قرآن حکیم کے جس منتخب نصاب کا سلسلہ وار مطالعہ ان صفحات میں ہو رہا ہے' اس کا درس نمبر ۱۱ سورۃ الفرقان کی آیات ۶۱ تا ۷۷ پر مشتمل ہے۔ اس منتخب نصاب کے پہلے حصہ میں چار جامع اسباق تھے۔ دوسرے حصہ میں کچھ ایسے مقامات تھے جن کے ذریعہ ایمان کے ضمن میں چند مباحث ہمارے سامنے آئے تھے۔ تیسرے حصہ میں اعمالِ صالحہ کی بحث ہے جو چل رہی ہے۔ اس کے پہلے سبق میں ان اوصاف کا بیان تھا جو از روئے قرآن حکیم انسان کی سیرت کی تعمیر' یا بقول علامہ اقبال مرحوم تعمیر خودی کے لئے بنیادی لوازم اور اساسات ہیں۔ زیر درس آیات کے مطالعہ اور ان کی ترجمانی سے آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ گزشتہ سبق کی طرح یہاں بھی چند اوصاف کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس طرح سورۃ المومنون کے پہلے رکوع میں چھ مرتبہ اسم موصولہ "اَلَّذِيْنَ" تکرار کے ساتھ آیا تھا اور سورۃ المعارج کی اُن آیات میں کہ جو سورۃ المومنون کی آیات کی ہم مضمون تھیں' آٹھ مرتبہ "اَلَّذِيْنَ" کی تکرار ہوئی' اسی طرح آج کے درس میں بھی "اَلَّذِيْنَ" ایک مرتبہ آیا ہے اور "وَالَّذِيْنَ" سات مرتبہ دہرایا گیا ہے کہ عباد الرحمٰن یعنی ہمارے محبوب بندوں میں یہ اور یہ اوصاف ہوتے ہیں' ان کی یہ اور یہ کیفیت ہوتی ہے' ان کی راتیں اس حال میں اور اس کیفیت میں بسر ہوتی ہیں' وہ جب خرچ کرتے ہیں تو ان کی روش یہ ہوتی ہے' وغیرہم۔

غور طلب بات یہ ہے کہ گزشتہ سبق اور اس سبق کے مابین منطقی ربط کیا ہے! آپ نے محسوس کر لیا ہو گا کہ اس مقام پر اُن اوصاف کا بیان ہو رہا ہے جنہیں ہم چوٹی کے

اوصاف کہہ سکتے ہیں۔ یعنی ایک پوری طرح تربیت یافتہ خودی یا ایک پوری طرح تعمیر شدہ شخصیت کے یہ خدوخال ہونے چاہئیں۔ ایک بندۂ مومن کے جو نمایاں اوصاف اللہ کو پسند ہیں' ان کا اس سبق میں نہایت جامع بیان آیا ہے۔ اسے ایک مثال سے واضح کیا جائے تو وہ یہ ہوگی کہ جیسے ہم ایک عمارت بناتے ہیں تو اس کا ایک ڈھانچہ (Structure) ہوتا ہے' جس میں سیمنٹ' لوہا' سریا اور لکڑی وغیرہ استعمال ہوتی ہے' اور عمارت کی اصل مضبوطی اور اس کا اصل استحکام اس کے Structure کی مضبوطی پر ہوتا ہے۔ پھر اس عمارت کی Finishing اور اس کی آراستگی ہے۔ یعنی عمدہ پلاسٹر ہو' رنگ و روغن اعلیٰ ہو اور اس عمارت کے خدوخال کی خوبصورتی مختلف پہلوؤں سے ظاہر ہو رہی ہو۔ ظاہر بات ہے کہ جب آپ کسی عمارت کو دیکھتے ہیں تو اس کا سٹرکچر نگاہوں کے سامنے نہیں آتا۔ وہ تو ایک مخفی اور نظروں سے اوجھل شے ہے۔ جو چیز سامنے آئے گی وہ اس کے نمایاں خدوخال ہیں۔ اگر عمارت دل آویز ہے' خوبصورت ہے' پلاسٹر اچھا ہوا ہے' رنگ و روغن عمدہ ہے تو وہ دیدہ زیب ہوگی اور آپ کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچے گی۔ بالکل یہی ربط و تعلق ہمارے سابقہ سبق اور اس سبق میں ہے۔ یوں سمجھئے کہ سیرت و شخصیت کی تعمیر کا اساسی پروگرام تو وہ ہے جس پر ہم دو مقامات کے حوالے سے غور کر چکے ہیں' لیکن ایک مکمل تعمیر شدہ انسانی شخصیت میں' جس کی تعبیر علامہ اقبال مرحوم نے یوں کی ہے کہ ؎

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن!

یہ دل آویزی جن اوصاف سے پیدا ہوتی ہے انہیں اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر نہایت جامعیت کے ساتھ بیان فرمادیا ہے۔

سب سے پہلے ہم اس سبق کی دو آیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے ضمن میں جو بحثیں اس سے قبل اس سلسلۂ دروس میں ہو چکی ہیں' ان کا نہایت جامع خلاصہ ان دو آیات میں آگیا ہے۔ فرمایا:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِیْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِیْرًا ۝ ﴾

"بڑی ہی بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمانوں میں برج بنائے اور اس (آسمان)

میں ایک چراغ روشن کیا (یعنی سورج) اور روشن چاند بنایا۔"

﴿ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً ﴾

"اور وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کے تعاقب میں لگا دیا۔"

گویا وہ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے ہیں۔ رات دن کا پیچھا کرتی ہوئی چلی آتی ہے اور دن جیسے رات کا تعاقب کرتے ہوئے نمودار ہوتا ہے۔ یہ قانونِ طبعی کی ایک بیّن حقیقت ہے۔ اسے سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں آیاتِ الٰہیہ سے تعبیر کیا گیا تھا : ﴿ اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ﴾ اور اُس موقع پر ہم نے سورۃ البقرۃ کے اکیسویں رکوع کی پہلی آیت (البقرہ : ۱۶۴) بھی تفصیل سے پڑھی تھی کہ اس کائنات کی ہر شے ایک نشانی ہے جس کو دیکھ کر لامحالہ ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کا ذہن اس کے خالق' اس کے مالک' اس کے صانع اور اس کے مصور کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ اور اس کائنات کے مشاہدات سے اُس ذات کی صفاتِ کمال کا اندازہ ہوتا ہے کہ جو اِس کائنات کا بنانے والا ہے' وہ جو "عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ" ہے' اُس کی قدرت میں کہیں کوئی کمی نہیں' اُس کے علم میں کہیں کوئی کمی نہیں' اس کی حکمت میں کہیں کوئی کمی نہیں' وہ "بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ" ہے' اور وہ ہستی "اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ" ہے۔

یہ درحقیقت وہی مضمون ہے جسے یہاں بھی تمہید کے طور پر بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ اِن آیات آفاقیہ پر غور و تدبر کرتے ہیں' جسے علامہ اقبال نے اس طرح تعبیر کیا کہ ؎

کھول آنکھ زمیں دیکھ' فلک دیکھ' فضا دیکھ
مشرق سے اُبھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

وہ لوگ جو اس وسیع و عریض کائنات میں پھیلی ہوئی آیات سے اُس کے خالق کی معرفت حاصل کرتے ہیں' انہی میں یہ اوصاف پیدا ہوں گے کہ جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ چنانچہ دوسری آیت کے آخر میں فرمایا :

﴿ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا ۝ ﴾

"(یہ نشانیاں ہیں) اس کے لئے جو چاہے تو یاددہانی حاصل کرے یا چاہے تو (اللہ کا) شکرگزار بنے۔"

ان الفاظِ مبارکہ سے آپ کے ذہن میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کا مضمون آگیا ہوگا کہ کائنات کے مشاہدہ سے جہاں تذکر حاصل ہوتا ہے' یاددہانی نصیب ہوتی ہے' ذہن اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہاں ساتھ ہی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا احساس پیدا ہوتا ہے' اُس کے احسانات کا ادراک حاصل ہوتا ہے کہ اُس نے انسان کی روزی کی فراہمی کے لئے کیا عظیم الشان نظام بنایا ہے! اُس نے انسان کی ہر ہر ضرورت کی بہم رسانی کے لئے کیا اعلیٰ انتظام و انصرام فرمایا ہے! وہ انسان کے جسم و جان کے تمام تقاضوں کو کس کس طریقہ سے پورا فرمارہا ہے۔ اس شعور و ادراک سے ایک دوسرا جذبہ جو انسان کے دل میں اُبھرتا ہے وہ جذبۂ شکر ہے۔ سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کی پہلی آیت ذہن میں تازہ کیجئے :

﴿ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا لُقْمٰنَ الْحِكْمَةَ اَنِ اشْكُرْ لِلّٰهِ ﴾

"ہم نے لقمان کو حکمت اور دانائی عطا فرمائی کہ کر شکر اللہ کا!"

تو معلوم ہوا کہ اس کائنات کے مشاہدہ سے اور آیاتِ سماوی' آیاتِ ارضی' آیاتِ آفاقی اور آیاتِ انفسی سے ایک سلیم الفطرت اور سلیم العقل انسان کو دو چیزیں اخذ کرنی چاہئیں —— ایک وہ جسے قرآن کریم تذکّر سے تعبیر کرتا ہے۔ یعنی اس کائنات کی وسعتوں میں انسان کی نگاہیں اُلجھ کر نہ رہ جائیں' بلکہ ان کو دیکھ کر ان پر غور و تدبّر سے اس کا خالق' اس کا مالک' اس کا صانع' اس کا مصور اور اس کا مدبر یاد آجائے اور ذہن و شعور اور عقل و ادراک اللہ تعالیٰ کی ذات کی طرف متوجہ ہو جائے۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی میرے توہّمات میں!

تو دل کی آنکھ سے اس کائنات کے ذریعے اللہ تک پہنچا جائے تو اس کا نام تذکر ہے —— اور دوسرے یہ کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ادراک ہو' اُس کے احسانات کا شعور

ہو' جس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اس کے دل میں تشکر کے جذبات وجود میں آئیں۔ ان دونوں کے لئے یہاں فرمایا گیا : ﴿ لِمَنْ اَرَادَ اَنْ یَّذَّکَّرَ اَوْ اَرَادَ شُکُوْرًا ۝ ﴾

اس رکوع کی پہلی دو آیات کا مضمون سمجھ لینے کے بعد اب ہم اگلی پانچ آیات (الفرقان : ۶۳-۶۷) کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان آیات میں اللہ تعالیٰ اپنے اُن بندوں کے اوصاف بیان فرما رہا ہے جو اُسے بہت ہی پسند اور محبوب ہیں۔ چنانچہ گفتگو کی جو ابتداء ہوئی ہے وہ ﴿ عِبَادُ الرَّحْمٰنِ ﴾ کے الفاظ سے ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں سے "اَلرَّحْمٰن" نہایت پیارا نام ہے۔ اس لئے بھی کہ یہ رحمت سے مشتق ہے' اور ظاہر بات ہے کہ بندوں کو جس چیز کی زیادہ احتیاج ہے' وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہی ہے۔ اور اس لئے بھی کہ اگرچہ رحمت سے اللہ تعالیٰ کا ایک نام اور بھی بنتا ہے اور وہ ہے الرّحیم —— لیکن "الرّحیم" میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی شان ایک مستقل اور دائم حقیقت کی حیثیت سے سامنے آتی ہے' جبکہ "اَلرَّحمٰن" میں اللہ تعالیٰ کی رحمت کی جو شان سامنے آتی ہے وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کے مانند ہے' جس میں جوش و خروش ہو' جس میں ہیجان ہو۔ یہ لفظ ہیجان بھی فعلان کے وزن پر عربی ہی کا لفظ ہے۔ اسی وزن پر عربی زبان میں متعدد الفاظ آتے ہیں۔ مثلاً عَطْشَان' انتہائی پیاسا' جس کی پیاس سے جان نکلی جا رہی ہو —— جَوْعَان نہایت بھوکا' جو بھوک سے مر رہا ہو —— تو اللہ تعالیٰ کا یہ نام نامی' اسم گرامی "اَلرَّحمٰن" بہت ہی پیارا ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ کی رحمت ایک ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر کی طرح سامنے آتی ہے۔

پھر "عِبَادُ الرَّحْمٰنِ" کے فرمانے میں بھی ایک محبت اور شفقت و عنایت کا اندازہ ہے یعنی اللہ کے محبوب بندے' اللہ کے پسندیدہ بندے یہ ہیں جن میں یہ اوصاف پائے جاتے ہوں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

ان اوصاف میں سے پہلا وصف آیا : ﴿ اَلَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا ﴾ "وہ لوگ جو زمین پر چلتے ہیں آہستگی سے' نرمی سے"۔ ان کی چال سے تواضع نمایاں ہوتی ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ جیسے انگریزی میں کہتے ہیں کہ "Face is the index of the mind" آپ کسی انسان کے چہرے کو دیکھ کر اس کے باطنی

احساسات و جذبات کا اندازہ کر سکتے ہیں' اسی طرح انسان کی چال سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں غرور ہے' یہ کسی فخر میں مبتلا ہے' یہ گھمنڈی ہے۔ اکڑ کر چلے گا تو اس کی چال بتائے گی کہ اس کی ذہنی کیفیت کیا ہے! یا پھر اس کی چال سے یہ ظاہر ہو گا کہ اس میں عجز و تواضع' فروتنی' انکساری اور خاکساری ہے۔ تو یہ ہے پہلا وصف ـــــ اور بندے کو یہ حقیقت پہچان لینی چاہئے کہ میں بندہ ہوں' آقا نہیں ہوں' آقا تو صرف ایک ہے اور وہ اللہ ہے' باقی بڑے سے بڑا انسان بھی بندہ ہے' اور عبدیت ہی در حقیقت ہمارا طرۂ امتیاز ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں جہاں بھی اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ سے خصوصی عنایت کے ساتھ خطاب فرمایا ہے' یا آپؐ کا ذکر خصوصی محبت و شفقت اور التفات کے ساتھ فرمایا ہے وہاں حضور ﷺ کی عبدیت کو نمایاں کیا جاتا ہے ـــــ جیسے : ﴿ سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا ﴾ اور : ﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ عَلٰی عَبۡدِہِ الۡکِتٰبَ ﴾ اور جیسے : ﴿ تَبٰرَکَ الَّذِیۡ نَزَّلَ الۡفُرۡقَانَ عَلٰی عَبۡدِہٖ لِیَکُوۡنَ لِلۡعٰلَمِیۡنَ نَذِیۡرَا۝ۙ ﴾ دیکھئے کس قدر لطیف ربط ہمارے سامنے آتا ہے۔ یہ اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت ہے جس کے آخری رکوع کا ہم مطالعہ کر رہے ہیں۔ اس سورۂ مبارکہ کے آخری رکوع کا آغاز بھی "تَبٰرَکَ الَّذِیۡ" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ آغاز میں فرمایا گیا : "بڑی بابرکت' بلند مرتبت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے (ﷺ) پر الفرقان (یعنی قرآن مجید) نازل فرمایا"۔

تو یہ عبدیت در حقیقت معراجِ انسانیت ہے۔ لہٰذا یہاں "عِبَادُ الرَّحۡمٰنِ" فرمانے میں بڑی شفقت' محبت' عنایت اور التفات کے پہلو مضمر ہیں۔ مراد ہیں وہ لوگ جو واقعی اللہ کے بندے ہیں' اُن کی چال ڈھال سے نمایاں ہوتا ہے کہ یہ اپنے آپ کو بندہ ہی سمجھتے ہیں' آقا نہیں سمجھتے۔ یہ اپنے آپ کو مملوک سمجھتے ہیں اور اپنے مالک' اپنے آقا کو پہچانتے ہیں۔ چنانچہ ان کی چال گواہی دیتی ہے کہ فخر و غرور کے بجائے ان میں عجز و فروتنی کے احساسات و جذبات جاگزیں ہیں۔

ہمارے اس منتخب نصاب کا جو تیسرا درس سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع پر مشتمل ہے' اس کے آخر میں بھی اسی وصف پر زور دیا گیا ہے : ﴿ وَلَا تُصَعِّرۡ خَدَّکَ لِلنَّاسِ

﴿ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا ۚ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ؁ ﴾ حضرت لقمانؑ اپنے بچے کو نصیحت فرماتے ہوئے کہتے ہیں کہ "اے میرے بچے! اپنے گال لوگوں کے لئے پھلا کر نہ رکھ اور زمین پر اکڑ کر مت چل۔ بے شک اللہ کو بالکل پسند نہیں ہیں شیخی خورے اور اترانے اور غرور و فخر سے کام لینے والے۔" تو یہاں نقطۂ آغاز وہ وصف ہے جہاں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے مضامین کی قریباً انتہا ہوئی تھی۔

اسی آیت میں دوسرا وصف بیان ہوا ہے : ﴿ وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُونَ قَالُوا سَلٰمًا ؁ ﴾ "اور جب جاہل ان سے الجھنا چاہتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے علیحدہ ہو جاتے ہیں" ـــــ یہ بھی درحقیقت انسان کی شخصیت کی پختگی کی ایک بہت بڑی علامت ہے۔ بعض لوگ اپنے جذبات سے مغلوب ہو کر لوگوں سے بے کار سی بحث و تمحیص میں الجھ جاتے ہیں۔ حالانکہ اس طرح کی بحث و مباحثہ کا حاصل کچھ نہیں ہوتا۔ ایک پختہ (mature) انسان کا لازمی وصف یہ ہو گا کہ وہ اندازہ کرے کہ اس کا مخاطب اِس وقت بات سمجھنے کے موڈ (mood) میں ہے یا محض بحث و نزاع پر تلا ہوا ہے' اور اگر وہ یہ محسوس کرے کہ یہ شخص اِس وقت افہام و تفہیم کے موڈ میں نہیں ہے' یہ میری بات کو سنجیدگی سے نہیں سن رہا' یہ ضد اور عناد میں مبتلا ہو چکا ہے' اِس وقت اس پر ہٹ دھرمی مسلط ہو چکی ہے' یہ خواہ مخواہ مجھ سے الجھ رہا ہے' بات کو سمجھنا اس کے پیش نظر سرے سے ہے ہی نہیں' تو بڑی خوبصورتی سے سلام کہہ کر اس سے علیحدہ ہو جائے۔ بعض جوشیلے قسم کے مبلغین ایسے موقع پر تلخی پر اتر آتے ہیں' تلخ کلامی اختیار کر لیتے ہیں' یا علیحدہ بھی ہوتے ہیں تو اس طور سے گویا لٹھ مار کر علیحدہ ہو رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پھر دوبارہ گفتگو کا موقع باقی نہیں رہتا۔ اگر آپ خوبصورتی کے ساتھ علیحدگی اختیار کریں تو موقع رہے گا کہ آپ آئندہ کسی مناسب وقت پر جب یہ محسوس کریں کہ یہ شخص سمجھنے سمجھانے کے موڈ میں ہے تو اس کے سامنے دوبارہ اپنی بات رکھنے کی پوزیشن میں ہو سکتے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں بڑی ہی پختہ اور mature شخصیت کے نمایاں اوصاف میں سے ہیں' جن سے یہاں گفتگو کا آغاز ہو رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ؁ ﴾ "اور جو راتیں بسر

کرتے ہیں اپنے رب کے حضور میں سجدہ کرتے ہوئے اور دست بستہ کھڑے رہ کر"
—— اب یہاں ایک فوری تقابل (Simultaneous Contrast) آپ کے سامنے رہے۔ ہمارے سابقہ درس میں نماز کا ذکر بار بار آیا تھا : ﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خَاشِعُوْنَ ○ ﴾ اور پھر ان اوصاف کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوا :
﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ○ ﴾ ابتداء بھی صلوٰۃ کے ذکر سے اور اختتام بھی صلوٰۃ کے ذکر پر۔ پہلے صلوٰۃ میں خشوع کا ذکر ہے جو اس کی باطنی روح ہے اور آخر میں صلوٰۃ کی محافظت اور مداومت کا ذکر ہے —— لیکن یہاں رات کی نماز یعنی تہجد کا ذکر ہے۔ اس لئے کہ ایک مسلمان میں جو بنیادی اوصاف درکار ہیں جن سے تعمیر سیرت کا وہ پروگرام وجود میں آتا ہے جو قرآن مجید دیتا ہے' اس کی ابتداء و انتہاء اقامت الصلوٰۃ یعنی نماز پنجگانہ کا اہتمام ہے جو فرض ہے۔ اس کی پابندی کرنا' اس کے تمام آداب اور جملہ شرائط کے ساتھ اس کی ادائیگی کا اہتمام کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہاں بات بالکل دوسری ہے۔ یہاں تو اس سطح کی گفتگو ہو رہی ہے جہاں ایک انسان اللہ تعالیٰ کی محبوبیت کا مقام اور درجہ حاصل کر لے۔ یہاں جس نماز کا ذکر ہے وہ رات کی تنہائی کی نماز ہے :
﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ○ ﴾ یعنی اِن کی راتوں کا نقشہ اُن لوگوں کی راتوں کی کیفیت سے بالکل مختلف ہے جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں' جو پوری رات پاؤں پھیلا کر سوتے ہیں۔ ان کو اس غفلت کا احساس تک نہیں ہوتا کیونکہ ان کے دل میں کوئی لگن نہیں ہے' ان کے دل میں اللہ کی محبت کا جذبہ نہیں ہے —— لیکن جن لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت گھر کر چکی ہو ان کو ان کا وہ جذبہ محبت رات کے وقت سونے نہیں دیتا۔ وہ رات کو بار بار اٹھتے ہیں' اپنے رب کے حضور دست بستہ کھڑے ہوتے ہیں یا اپنے رب کے سامنے سجدہ ریز رہتے ہیں۔ نبی اکرم ﷺ کی رات کی نماز کی کیفیات کے متعلق ہمیں روایات میں یہ نقشہ ملتا ہے کہ آپؐ راتوں کو بار بار اٹھتے تھے' چونک چونک کر اُٹھتے تھے اور آپؐ اپنے رب کے سامنے نماز میں دست بستہ کھڑے ہوتے تھے' سجدہ ریز ہوتے تھے۔ بندۂ مومن کی شخصیت کے تکمیلی اوصاف میں یہ رات کی نماز یعنی تہجد یا قیام اللیل عظیم ترین اہمیت کی حامل ہے —— اور اساسی و بنیادی اوصاف میں سب سے

زیادہ اہم وصف اقامت الصلوٰۃ یعنی پنج وقتہ فرض نماز کی پابندی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ رات کے وقت کی اس نماز کی پابندی کر رہے ہوں، کیسے ممکن ہے کہ وہ فرض نمازوں کے نظام میں کسی درجہ میں بھی کوتاہی یا غفلت سے کام لیں ـــــ!!

اس کے بعد فرمایا کہ اپنے رب کے سامنے اس قیام اللیل کے نتیجہ میں جو دعا ان کے دل سے نکل کر زبان پر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ﴿ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ﴾ "اے رب ہمارے! ہمیں جہنم کی سزا سے بچا، اس کو ہم سے دور کر دے"۔ اس میں درحقیقت اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے کہ جہاں مخلوق کے سامنے ان کی روش تواضع اور فروتنی کی ہوتی ہے، وہاں وہ اپنے رب کے سامنے بھی نہایت عاجزی کا انداز اختیار کرتے ہیں۔ انہیں اپنی نیکی پر کوئی فخر یا غرور نہیں ہوتا۔ وہ کسی زعم یا گھمنڈ میں مبتلا نہیں ہوتے، بلکہ ان کو ہمیشہ یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ نہ معلوم ہمارے اعمال اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہو رہے ہیں یا نہیں! لہٰذا ان پر ایک لرزہ طاری رہتا ہے۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ النور کے پانچویں رکوع کی آیات میں آچکا ہے کہ وہ لوگ اپنے رب کے عذاب سے خائف رہتے ہیں، لرزاں و ترساں رہتے ہیں ـــــ چنانچہ ہم کبار صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے حالات میں یہ پڑھتے ہیں کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک عجیب کیفیت کے عالم میں یہ فرمایا کرتے تھے کہ کاش! میں گھاس کا ایک تنکا ہوتا جو جلا دیا جاتا ہے اور اس سے کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا۔ کاش! میں درختوں پر چہچہانے والی ایک چڑیا ہوتا جو چہچہاتی ہے، پھر ختم ہو جاتی ہے، لیکن اس سے کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ویسے تو آپؓ کا جسم بہت گٹھا ہوا اور بڑا مضبوط تھا لیکن جب آپؓ نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو جسم خشیت الٰہی سے نہایت نرم پڑ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ آپؓ کے جسم میں ایک تیر پیوست ہو گیا جو نکالے نکل نہیں رہا تھا۔ آپؓ نے فرمایا کہ مجھے نماز کی نیت باندھ لینے دو، اس حالت میں تیر نکال لینا۔ یہ ہے وہ کیفیت : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ ﴾ اس کے ساتھ ہی فرمایا : ﴿ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ۝ ﴾ یہ جہنم کا عذاب تو چمٹ جانے والی چیز ہے، یہ عذاب تو جان کو لاگو ہو جانے والا ہے، اس سے انسان کو چھٹکارا نہیں ملے گا ـــــ آگے جہنم کے بارے میں الفاظ آئے ہیں : ﴿ اِنَّهَا

سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ "یقیناً وہ مستقر بھی بہت برا ہے اور مقام بھی"۔ عربی زبان میں "مستقر" جائے قرار کو کہتے ہیں' جہاں انسان کا مستقل ٹھکانا ہو۔ اردو میں بھی مستقر اسی معنی میں مستعمل ہے ــــــ اور "مقام" کے معنی ہیں قیام کی جگہ۔ جہاں بھی تھوڑی دیر کے لئے انسان رکتا ہے وہ اس کا مقام ہے۔ تو ان الفاظ کے ذریعے یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ جہنم اتنی بُری جگہ ہے کہ اگر کسی کی مستقل جائے قرار بن جائے تو اس کی بربادی' رسوائی اور ہلاکت کا ذکر ہی کیا ہے! یہ تو اتنی بری جگہ ہے کہ اس میں اگر تھوڑی دیر کے لئے بھی قیام ہو تو یہ اپنی تمام ہولناکیاں اور سختیاں پورے طور پر ظاہر کردے گی۔ عام طور پر ہمارا یہ تصور ہے کہ کسی اچھی سے اچھی جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اس میں دلچسپی اور رعنائی نہ رہے گی' انسان اُکتا جائے گا' اور بری سے بری جگہ پر بھی انسان اگر تھوڑی دیر کے لئے چلا جائے تو یہ تبدیلی اس کے لئے تفریح کا ذریعہ بن جائے گی۔ لیکن یہاں آپ الفاظ دیکھیں گے : ﴿ اِنَّهَا سَآءَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ ــــــ اور اس رکوع کے آخر میں جنّت کے بارے میں آئے گا : ﴿ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴾ یہ بھی ایک فوری تقابل کے لئے ہے کہ جنت اتنی اچھی جگہ ہے کہ انسان اس میں ہمیشہ کے لئے رہے گا تب بھی اس جنت کی رعنائیوں' دل آویزیوں' لطافتوں اور دلچسپیوں میں اسے کوئی کمی محسوس نہیں ہوگی' انسان اکتائے گا نہیں' اور جہنم اتنی بری جگہ ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اگر کسی کو اس میں داخل کردیا جائے تو وہ اپنی ساری شدتیں' اپنی ساری غلظتیں' اپنی ساری کلفتیں آنِ واحد میں ظاہر کردے گی۔

اس کے بعد فرمایا "وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں تو میانہ روی اختیار کرتے ہیں۔" یہ بھی شخصیت کی پختگی اور بالغ نظری کی علامت ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اگر ایک وقت ہاتھ کشادہ ہے تو انسان اللوں تللوں میں پیسہ اڑادے اور اگر کسی وقت تنگی ہوگئی ہو تو انسان بالکل بجھ کر رہ جائے ــــــ اور نہ ایسا ہو کہ جہاں خرچ کرنا لازمی اور ضروری ہو وہاں وہ ہاتھ روک لے' یہ بخیلی ہے ــــــ ان تین رویوں کے بجائے ایک بین بین اور معتدل روش اختیار کرنا ایک اعلیٰ و ارفع وصف ہے۔ لہٰذا فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا ﴾ "وہ لوگ جو جب خرچ کرتے ہیں تو نہ اسراف سے کام لیتے ہیں" ﴿ وَلَمْ

يَقْتُرُوْا﴾ "اور نہ بخل سے کام لیتے ہیں" بلکہ : ﴿وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا﴾ "ان کا طرز عمل اس کے بین بین ہوتا ہے" ۔ یہ بات بھی سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے آخر میں آئی تھی : ﴿وَاقْصِدْ فِيْ مَشْيِكَ﴾ "اپنی چال میں میانہ روی اختیار کر" ـــــــ یہاں چال ڈھال میں بھی اعتدال مراد ہے اور خرچ میں بھی ـــــــ تو وہی وصف ہے جو یہاں ایک دوسرے اسلوب سے بیان ہوا۔

اگلی دو آیات میں فرمایا :

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○ يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ○﴾

"اور وہ لوگ جو نہیں پکارتے اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو' اور نہ وہ قتل کرتے ہیں کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ' اور نہ ہی وہ زنا کرتے ہیں' اور جو کوئی یہ کام کرے گا وہ اس کی پاداش پائے گا۔ دگنا کیا جائے گا اس کے لئے عذاب کو قیامت کے دن' اور وہ رہے گا اس میں ہمیشہ نہایت ذلیل و خوار ہو کر۔"

اُن مثبت اوصاف اور مثبت اقدار کے ذکر کے بعد جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں' جن سے ایک بندۂ مومن کی شخصیت میں دل آویزی اور جاذبیت پیدا ہوتی ہے اور جو ایک مومن کی شخصیت کی پختگی اور "maturity" کی علامات ہیں' اب ان دو آیات میں انداز بیان منفی ہے۔ یعنی عباد الرحمٰن میں یہ چیزیں بالکل نہیں ہوتیں' وہ اِن چیزوں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے۔

اس سلسلے میں قرآن مجید کی حکمت کا ایک اہم باب ہمارے سامنے آ رہا ہے کہ وہ کون کون سے کام ہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ مغضوب اور مبغوض ہیں' جن سے وہ سخت ناراض ہوتا ہے اور جن سے اس کا غیظ و غضب شدید ترین طور پر بھڑکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ ہمارے یہاں جو یہ تصور ہے کہ ایک گناہ کبیرہ ہوتے ہیں اور ایک گناہ صغیرہ ہوتے ہیں ـــــــ تو ہم سمجھیں کہ کبیرہ گناہوں میں چوٹی کے گناہ کون

سے ہیں!!ان دو آیات میں سے پہلی آیت چوٹی کے تین گناہوں کو معین کر رہی ہے۔یعنی اس ایک آیت میں کبائر میں سے درجہ بدرجہ تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر ہے۔ سب سے کبیرہ گناہ، عظیم ترین گناہ، جس کے بارے میں سورۃ النساء میں دو مرتبہ یہ الفاظ وارد ہوئے : ﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ﴾ "اللہ اس کو تو ہرگز معاف نہیں فرمائے گا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے اور اس سے کمتر (گناہ) جس کے لئے چاہے گا معاف فرما دے گا" ـــــ گویا قرآن مجید کی رُو سے ہمارے دین میں سب سے بڑا جرم، سب سے بڑا اور قطعی نا قابل معافی گناہ شرک ہے۔

سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں "اقسامِ شرک" کے موضوع پر کچھ مختصر گفتگو ہوئی تھی کہ ایک شرک ہے شرک فی الذات۔یعنی اللہ کی ذات کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا۔ اور ایک شرک وہ ہے جو اللہ کی صفات کے ضمن میں ہے۔یعنی شرک فی الصفات ـــــ اور تیسرا شرک ہے شرک فی العبادت۔ اور نبی اکرم ﷺ نے عبادت کے لُبِّ لباب کی حیثیت دعا کو دی ہے : اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ اور اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةِ۔ "دعا ہی عبادت کا اصل جوہر ہے" اور "دعا ہی اصل عبادت ہے"۔ لہٰذا یہاں آپ نے دیکھا کہ فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ﴾ "وہ لوگ جو اللہ کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے"۔ یہ پکارنا کس مقصد کے لئے ہوتا ہے؟ ظاہر ہے کہ استمداد، استدعاء، استغاثہ اور استعانت کے لئے۔یعنی کسی کو پکارنا اپنی کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ـــــ پکارنا کسی کو اپنی کسی مصیبت کو دور کرنے کے لئے ـــــ پکارنا کسی کو اپنی حاجت روائی کے لئے ـــــ پکارنا کسی کو اپنی مشکل کشائی اور دستگیری کے لئے ـــــ پکارنا کسی کو اپنی مدد و اعانت کے لئے۔ غور کیجئے کہ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ "اللہ کو چھوڑ کر کسی اور معبود کو پکارے" بلکہ "اللہ کے ساتھ کسی اور کو پکارنا" یہ شرک ہے۔ پس یوں سمجھئے کہ ہمارے دین میں شرک تو اکبر الکبائر ہے۔ کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑا کبیرہ گناہ شرک ہے۔ چنانچہ آغاز میں سب سے پہلے تو اسی کا ذکر ہوا۔ اس لئے کہ درحقیقت شرک سے انسان کا نقطۂ نظر غلط ہو جاتا ہے۔ گویا پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی لگ گئی تو اس کے بعد اس کا جو نتیجہ نکلے گا وہ ظاہر ہے کہ ـ

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج

پھر تو کجی ہی کجی ہو گی۔ انسان کی اپنی ذاتی سیرت میں بھی کجی ہو گی۔ ایسے لوگوں پر مشتمل جو معاشرہ وجود میں آئے گا وہ بھی کج ہو گا۔ لہٰذا یہاں سب سے پہلے شرک کا ذکر ہوا۔

دوسرے بڑے گناہ کا ذکر بایں الفاظ ہوا : ﴿ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ ـــــ اس کا تعلق انسانی جان کے احترام سے ہے۔ یہ بات جان لیجئے کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ قتلِ عمد ہے۔ اس لئے کہ اس سے تمدن کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ یہ جو ہم کہتے ہیں کہ انسان ایک متمدن حیوان ہے' انگریزی میں کہا جاتا ہے کہ "Man is a Gregorious Animal" تمدن کی بنیاد مل جل کر رہنا ہے۔ تہذیب' تمدن اور حضارت مل جل کر رہنے سے ہی وجود میں آتی ہے' اور اس کی جڑ اور بنیاد یہ ہے کہ انسان ایک دوسرے کی جانوں کا احترام کریں۔ اگر احترام جان ہی ختم ہو گیا تو گویا تمدن کی اساس ہی منہدم ہو گئی۔ لہٰذا تہذیب و تمدن کی بقا کے لئے لازم ہے کہ معاشرے کے اندر احترام جان کا پورا پورا اہتمام و التزام رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بہت محترم ٹھہرایا ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض ایسی صورتیں ہیں کہ جہاں کوئی شخص قانون کی زد میں آ کر قتل کا مستوجب قرار پائے گا اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔

شریعت میں ﴿ اِلَّا بِالْحَقِّ ﴾ کی مصداق چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ قتل عمد کی صورت میں اگر مقتول کے وارث دیت یا خون بہا لینے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوں اور معاف کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں تو جان کے بدلے جان لی جائے گی : ﴿ اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ﴾ دوسری یہ کہ کوئی شخص شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے تو شریعت میں اس کے لئے رجم کی سزا ہے کہ اس کو سنگسار کیا جائے تا آنکہ وہ ہلاک ہو جائے۔ تیسری یہ کہ اسلام میں ارتداد کی سزا قتل ہے۔ چوتھی یہ کہ وہ کافر جو حربی ہو' جس کے ساتھ باقاعدہ اور اعلانیہ جنگ ہو رہی ہو۔ کسی اسلامی ریاست کا پُرامن ذمی یا معاہد غیر مسلم اس کا مصداق نہیں بن سکتا۔ اس کی جان تو اتنی ہی محترم ہے جتنی کسی مسلمان کی جان ہے۔ اُسے وہی تحفظات حاصل ہیں جو کسی مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ البتہ جہاں کفار و

مشرکین کے ساتھ جنگ ہو رہی ہو وہاں کافر کی جان مومن کے لئے حلال ہو گی ـــــ ان چار صورتوں کے سوا کسی بھی حالت میں انسانی جان کا لینا قتل ناحق ہو گا ـــــ اور اس آیت مبارکہ کی رُو سے قتل ناحق کے متعلق یہ جان لیجئے کہ دین اسلام کے نظام میں شرک کے بعد یہ سب سے بڑا جرم ہے۔

تیسری بات فرمائی کہ ﴿ وَلَا يَزْنُوْنَ ﴾ "اور وہ زنا نہیں کرتے" ـــــ ہم اس سے پہلے سورۃ المؤمنون اور سورۃ المعارج کی بعض آیات کے درس میں دیکھ چکے ہیں کہ اپنے شہوانی جذبات پر قابو پانے (Sex Discipline) کی کتنی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ دونوں مقامات پر فرمایا : ﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ○ اِلَّا عَلٰٓى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ○ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ○ ﴾ یہاں وہی بات ہے لیکن اسلوب منفی ہے۔ وہاں مثبت پہلو سے بیان کیا گیا کہ وہ لوگ اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں، اپنی شہوت پر قابو یافتہ ہیں، حلال راستہ کے علاوہ اپنی شہوت کی تسکین کے لئے کوئی حرام راستہ اختیار نہیں کرتے۔ یہاں وہی بات منفی اسلوب سے بیان فرمائی کہ "وہ زنا نہیں کرتے"۔ البتہ یہاں جس سیاق (Context) میں یہ بات آئی ہے اس سے ہمارے سامنے یہ عظیم حقیقت آتی ہے کہ قتل ناحق کے بعد سب سے بڑا جرم زنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ فعل بد رواج پا جائے اس میں سے اعتماد باہمی اور محبت و الفت بالکل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے کہ باہمی محبت کا سرچشمہ ایک شوہر اور اس کی بیوی کے مابین اعتماد کا احساس ہے۔ اگر یہ اعتماد موجود ہے تو محبت بھی ہو گی، مودت بھی ہو گی اور یہ خاندان اس دُنیا میں جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ کی کیفیت کا مظہر بن جائے گا۔ لیکن اگر کسی معاشرہ میں بد چلنی کا رواج ہو جائے، شوہر کو بیوی پر اعتماد نہ رہے اور بیوی کا شوہر پر اعتماد اٹھ جائے اور بے اعتمادی باہمی اعتماد کی جگہ لے لے تو اس معاشرے میں اعلیٰ اوصاف کبھی ترقی نہیں کریں گے۔ جو نئی نسل اس گھر میں پرورش پائے گی، اس میں حسنات اور اعلیٰ اخلاق کبھی بھی نشوونما نہیں پا سکیں گے، بلکہ ایسے ماحول میں پرورش پانے والی نسل میں ایک منفی کردار پیدا ہو جائے گا۔ تو گویا زنا وہ چیز ہے جو تمدن میں حسن و خوبی کے پھول کھلانے کے بجائے اسے ایک

متعفن سنڈاس بنا کر رکھ دے گی۔ لہٰذا تیسری چیز ہے : ﴿وَلَا یَزْنُوْنَ﴾ "اور وہ زنا نہیں کرتے"۔

ان تین سب سے بڑے گناہوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا : ﴿وَمَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِكَ یَلْقَ اَثَامًا ۝﴾ جو کوئی بھی ان میں سے کسی فعل کا ارتکاب کرے گا ـــــ یعنی شرک کرے گا' اللہ کے ساتھ کسی اور کو بھی حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لئے پکارے گا' کسی اور کی بھی عبادت کرے گا' یا وہ انسانی جان ناحق لے گا' انسانی خون ناحق بہائے گا' یا وہ زنا کرے گا ـــــ تو وہ جان لے کہ اس کی پاداش اس کو بھگتنی پڑے گی : "یَلْقَ اَثَامًا" ـــــ وہ یہ نہ سمجھے کہ بچ نکلے گا' کوئی گرفت نہیں ہے' کوئی سزا نہیں ہے۔ اگر اس دُنیا میں اسے سزا نہیں ملی تو آخرت میں اسے اس کا بھرپور خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔

اگلی آیت میں فرمایا : ﴿یُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ "قیامت کے دن اس کے لئے عذاب دُگنا کر دیا جائے گا" ـــــ اس کا ایک مفہوم تو یہ لیا گیا ہے کہ یہ عذاب بڑھتا چلا جائے گا' اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا۔ بجائے اس کے کہ سزا اور عذاب میں تخفیف یا کمی واقع ہو' اس کی تندی اور سختی میں زیادتی ہوتی چلی جائے گی۔ لیکن اس کا ایک دوسرا مفہوم بھی ہے' جو اپنے اندر ایک لطیف نکتہ لئے ہوئے ہے۔ بعض حضرات کا یہ گمان ہے کہ عذابِ اُخروی اور یوم القیامہ سے قبل عالم برزخ کے عذاب یا بالفاظ دیگر عذابِ قبر کی جو خبریں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوۃ والسلام میں ہیں' قرآن مجید میں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تو ایسے سب حضرات کے لئے جو قرآن میں ذکر نہ ہونے کی وجہ سے عذابِ قبر کو تسلیم کرنے میں متأمل ہیں' یہ مقام بہت ہی لائق توجہ ہے۔ فرمایا : ﴿یُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ﴾ "دوگنا کر دیا جائے گا اس کے لئے عذاب قیامت کے دن" ـــــ اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل رہی ہے کہ قیامت کے دن سے پہلے بھی عذاب موجود ہے' جس کو دوگنا کرنے یا جس میں اضافہ کرنے کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ عذاب ہے جسے ہم عذابِ قبر سے تعبیر کرتے ہیں اور جس کی خبر ہمیں نبی اکرم ﷺ نے احادیث میں دی ہے' اور یہ احادیث محدثین کے مقررہ کردہ سخت سے سخت معیار کے مطابق مستند اور صحیح تسلیم کی گئی ہیں۔

اگر کسی کو یہ اشکال ہو کہ ابھی قیامت کی عدالت تو لگی ہی نہیں' ابھی حساب کتاب اور وزن اعمال تو ہوا ہی نہیں تو اس سے پہلے سزا کیسی؟ تو ان کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ انسان جو کچھ کرتا ہے اسے خوب جانتا ہے : ﴿ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ ﴾ یہ آیت ہم سورۃ القیامہ میں پڑھ چکے ہیں۔ وہ طالب علم جس نے امتحان میں کچھ نہیں کیا' وہ جانتا ہے کہ اس نے پرچے کیسے کئے ہیں۔ چنانچہ امتحان کا نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی اس کی جان سوکھتی رہتی ہے۔ اس کو معلوم ہوتا ہے کہ میری کارکردگی کیا ہے جس کا نتیجہ کے طور پر اعلان ہونے والا ہے۔ نتیجہ کے اعلان کے دن سے پہلے ہی وہ گویا ایک نوع کے کرب اور کوفت کی کیفیت میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو یہی ہے اصل حقیقت کہ اس دُنیا سے عالم برزخ کی طرف منتقل ہونے کے فوراً بعد اِس چیز کا ایک عکس انسان کی روح پر پڑنا شروع ہو جاتا ہے جو کچھ اُس نے اِس دُنیا میں کیا ہے۔ یہی ہے وہ بات جس کو نبی اکرم ﷺ نے یوں تعبیر فرمایا کہ "قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے" —— اِدھر آنکھ بند ہوئی' اُدھر عالم برزخ میں آنکھ کھل گئی' اور اس میں انسان پر ان کیفیات کا ایک عکس پڑنا شروع ہو جاتا ہے جن سے اُسے بالآخر اپنے اعمال کی پاداش میں قیامت کے دن دوچار ہونا ہے۔ اس آیت مبارکہ کے ایک حصہ میں کس قدر خوبصورتی سے اس طرف ایک لطیف اشارہ آگیا : ﴿ يُضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ﴾ قیامت کے دن تو عذاب دوگنا ہو جائے گا' عذاب بڑھ چڑھ کر آئے گا اور پھر انسان اس میں ہمیشہ رہے گا۔ ﴿ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴾ خلود اور دوام اس کا مقدر ہو گا اور وہ اس میں رہے گا نہایت ذلیل و خوار ہو کر' رسوا ہو کر۔ اور یہ ذلت بھی دائمی ہو گی' اس سے رُستگاری ممکن نہیں ہو گی۔ البتہ ایک استثناء ہے جو اگلی آیت میں بیان ہو رہا ہے۔

﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ○ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاِنَّهٗ يَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ○ ﴾ (الفرقان : ۷۰'۷۱)

"سوائے اس کے جو تائب ہوا اور ایمان لایا اور اس نے اچھے عمل کئے' تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں اور نیکیوں سے بدل دے گا' اور اللہ

تو ہے ہی مغفرت فرمانے والا' رحم فرمانے والا۔ اور جو توبہ کرتا ہے اور اچھے عمل کرتا ہے تو وہی ہے جو توبہ کرتا ہے اللہ کی جناب میں جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔"

ان دو آیات کا مضمون ان سے پہلی دو آیات سے مربوط ہے' جن میں تین بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا گیا' یعنی شرک' قتل ناحق اور زنا ـــــ اور فرمایا گیا کہ جو کوئی ان جرائم کا مرتکب ہو گا اسے سزا مل کر رہے گی' اور سزا بھی وہ جس میں اضافہ ہو تا رہے گا' اور پھر اس کے لئے خلود یعنی ہیشہ ہمیش کے لئے سزا ہے۔ تو یہ نقشہ بعض اعتبارات سے خاصا مایوسی پیدا کرنے والا ہے کہ اگر کسی شخص سے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب ہوا ہو تو گویا یہ صورت حال اس کے لئے بڑی مایوس کن ہو گی۔ مایوسی کے اس اندھیرے میں اگلی دو آیات اُمید کی ایک کرن بن کر نمودار ہوتی ہیں۔

فرمایا : ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ ﴾ ہاں جو توبہ کرلے وہ بچ جائے گا۔ معلوم ہوا کہ گناہ کے اثرات اشیاء کے مادی اور طبعی اثرات کی طرح نہیں ہیں کہ ان کا ظہور لازماً ہو۔ جیسے اگر آپ نے آگ میں انگلی ڈالی تو وہ لازماً جل کر رہے گی۔ اس کے بعد اگر آپ توبہ کریں تو اس توبہ سے آگ کا اُنگلی پر جو اثر ہوا ہے وہ زائل نہیں ہو گا' وہ جلی رہے گی۔ اس لئے کہ یہ ایک طبعی اثر (Physical Effect) ہے۔ لیکن اخلاقی جرائم کا معاملہ ایسا نہیں ہے۔ اگر کوئی گناہ ہوا ہو' کوئی خطا ہوئی ہو تو لازم نہیں ہے کہ اس کا اثر ضرور ظاہر ہو۔ بلکہ اس سے بچاؤ کا ایک راستہ ہے' اور وہ در حقیقت توبہ کا راستہ ہے۔ توبہ کی عظمت اور توبہ کی حقیقت کے بیان میں قرآن کا یہ مقام نہایت اہم ہے۔ بلکہ اس اعتبار سے اس کو قرآن مجید کی چوٹی قرار دینا غلط نہ ہو گا۔

پہلے اصولی طور پر یہ سمجھ لیجئے کہ توبہ کی اہمیت کیا ہے! انفرادی اعتبار سے بھی یہ بات بڑی آسانی سے سمجھ میں آجائے گی کہ اگر انسان اس مغالطہ میں مبتلا ہو کہ مجھ سے جو خطا ہو چکی ہے اس کی سزا تو مجھے لازماً بھگتنی پڑے گی' تو انسان پر مایوسی مسلط ہو جائے گی اور اصلاح کے لئے جو ہمت اور ارادہ درکار ہے' وہ اس میں باقی نہیں رہے گا۔ چنانچہ کتب احادیث میں ایک بہت ہی دلچسپ واقعہ ملتا ہے جو جناب نبی اکرم ﷺ نے صحابہؓ کو سنایا۔

اس حدیث کے راوی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ ہیں اور یہ متفق علیہ روایت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ تم سے پہلے جو امتیں گزری ہیں' ان میں سے کسی اُمت کے ایک فرد کا یہ واقعہ ہے کہ وہ بڑا سفاک قاتل تھا' اس نے ننانوے انسانوں کو قتل کیا تھا۔ لیکن پھر اس کی طبیعت میں کچھ تبدیلی پیدا ہوئی تو وہ ایک بہت بڑے عالم کے پاس گیا اور اس سے کہا کہ میں ننانوے انسانوں کو قتل کر چکا ہوں' کیا اب بھی میری مغفرت کا کوئی راستہ کھلا ہے ؟۔ اُس عالم نے کہا کہ نہیں' تمہاری مغفرت کی اب کوئی سبیل نہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ اس شخص نے اُس عالم کو بھی قتل کر دیا کہ میں ننانوے قتل تو پہلے ہی کر چکا ہوں' سو کیوں نہ پورے کر لوں! ـــــ پھر اس نے ایک اور بڑے عالم کی طرف رجوع کیا۔ اس نے بتایا کہ نہیں' اللہ کی مغفرت و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوتا' اگر تم اب بھی صدق دل سے توبہ کرو تو اللہ تمہارے گناہ بخش دے گا۔ پھر اس عالم نے اس کی رہنمائی بھی کی کہ فلاں جگہ چلے جاؤ' وہاں تمہیں بہتر ماحول ملے گا۔ تم اب تک جس ماحول میں رہے ہو اگر تم اسی میں رہے تو شاید تم اپنی اصلاح نہ کر سکو۔ وہ شخص اپنی اصلاح کے ارادہ سے اس مقام کی طرف چل پڑا جس کی رہنمائی اس عالم نے کی تھی۔ ابھی راستے ہی میں تھا کہ اس کی موت کا وقت آ گیا۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اس کے بارے میں فرشتوں کے مابین یہ اختلاف رونما ہوا کہ اس کی رُوح کو عذاب والے فرشتے قبض کر کے لے کر جائیں یا رحمت والے فرشتے! اللہ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوا کہ راستہ ماپ لو۔ وہ راستہ جس طرف وہ اصلاح احوال کی غرض سے قیام کے ارادہ سے چلا تھا اگر اس راستہ سے کم رہ گیا ہے جو وہ طے کر چکا ہے تو اس کی روح کو رحمت کے فرشتے لے کر جائیں' بصورت دیگر اُس کی روح کو عذاب والے فرشتے لے کر جائیں۔ راستہ ماپا گیا تو جس مقام کے ارادہ سے وہ شخص چلا تھا وہ راستہ کم پایا گیا' لہٰذا رحمت والے فرشتے اس کی رُوح کو لے کر برزخ کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک حدیث میں وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو وہ راستہ جو ابھی طے کرنا باقی تھا وہ سمٹ گیا' جبکہ وہ راستہ جو وہ طے کر چکا تھا وہ پھیل گیا۔

تو یہ ہے توبہ کا معاملہ انفرادی اصلاح کے ضمن میں کہ انسان جب بھی جاگ جائے، جب بھی ہوش میں آجائے، اگر سچے دل سے توبہ کرلے تو اللہ تعالیٰ نے مغفرت کی اُمید دلائی ہے۔ ایک حدیث میں الفاظ آئے ہیں کہ خواہ اس کے گناہوں کا ڈھیر کوہ اُحد جتنا بلند ہو تب بھی سچی توبہ کے عوض اللہ تعالیٰ ان کو معاف فرمادے گا۔ اور مغفرت کے ضمن میں قرآن مجید کی سب سے زیادہ امید افزاء آیت سورۃ الزمر کی یہ آیت ہے :

﴿ قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ، اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا، اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ○ ﴾

"(اے نبی) فرمادیجئے کہ اے میرے وہ بندو جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ! اللہ تمام گناہ بخشنے کا اختیار رکھتا ہے۔ اور وہ ہے ہی بخشنے والا، رحم فرمانے والا۔"

دنیا کے دوسرے مذاہب نے اپنے فلسفۂ اخلاق میں توبہ کے بارے میں بہت ٹھوکریں کھائی ہیں جس کے باعث ان کا نقطۂ نظر بہت کج ہو گیا ہے۔ مثلاً ایک عقیدہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جو خطا ہو گئی تھی، جب کہ اُنہیں آزمائشی طور پر جنت میں رکھا گیا تھا اور ایک خاص درخت کا پھل کھانے سے منع کر دیا گیا تھا مگر شیطان کے ورغلانے سے انہوں نے اس درخت کے پھل کو کھالیا تھا، تو یہ گناہ گویا اب نسل آدم میں منتقل ہو رہا ہے۔ نوعِ انسانی کا جو بچہ پیدا ہو رہا ہے وہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہوتا ہے، وہ اپنے جدِ امجد کے گناہ کی گٹھری لے کر اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جہاں یہ غلط عقیدہ ہو گا وہاں اس پر مزید غلطیاں ہوں گی۔ چنانچہ پھر "کفارہ" کا عقیدہ ایجاد کیا گیا۔ یہ بنائے فاسد علی الفاسد ہے۔ اس کے برعکس قرآن مجید یہ بتاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے غلطی ضرور ہوئی تھی، لیکن انہوں نے توبہ کی :

﴿ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ○ ﴾ (الاعراف : ۲۳)

"اے رب ہمارے! ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے، اب اگر تو ہم کو معاف نہیں فرمائے گا اور ہم پر رحم نہیں فرمائے گا تو لازماً ہم خسارہ اٹھانے والوں میں سے ہو

جائیں گے۔"

اور سورۃ البقرہ میں فرمایا :

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾

"آدم نے کچھ کلمات اپنے رب سے حاصل کئے (اور جب ان کلمات کے ذریعے اللہ سے توبہ کی) تو اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔"

مزید یہ کہ توبہ کے بارے میں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی کتب احادیث میں موجود ہے :

((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لاَ ذَنْبَ لَهٗ))

"جو کوئی کسی گناہ سے توبہ کر چکا اس کے لئے کوئی گناہ ہے ہی نہیں۔"

گویا وہ ایسے ہے جیسے اس نے کبھی گناہ کیا ہی نہیں تھا۔ لہٰذا اب اس کا کوئی سوال نہیں ہے کہ نسل آدم علیہ السلام کا ہر بچہ پیدائشی طور پر گناہ گار ہو ـــــــ معاذ اللہ۔ قرآن مجید کا فیصلہ تو یہ ہے :

﴿ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ﴾ (الروم : ۳۰)

"اللہ کی وہ فطرت جس پر اس نے انسان کو پیدا کیا ہے۔"

حضور ﷺ نے فرمایا :

((مَا مِنْ مَوْلُوْدٍ اِلاَّ يُوْلَدُ عَلَى الْفِطْرَةِ، فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهٖ اَوْ يُنَصِّرَانِهٖ اَوْ يُمَجِّسَانِهٖ)) (متفق علیہ)

یعنی نسل آدم کا ہر بچہ فطرتِ اسلام پر پیدا ہوتا ہے، وہ تو اس کے والدین ہیں جو اُسے یہودی یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ پس قرآن مجید کے فلسفہ میں اور بعض دوسرے مذاہب کے فلسفہ میں یہ بڑا عظیم فرق و تفاوت ہے۔

اب ہمیں اس بات کو سمجھنا ہے کہ توبہ کی شرائط کیا ہیں! صرف زبان سے کہہ دینے سے توبہ نہیں ہو جائے گی۔ توبہ کی چند شرائط اور کچھ لوازم ہیں۔ اگر وہ شرائط پوری نہ ہوں تو چاہے آدمی توبہ کی تسبیح پڑھتا رہے اور صرف زبانی طور پر استغفار کا کتنا ہی ورد کرتا رہے اسے توبہ نہیں کہا جائے گا۔ چنانچہ امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے جو بہت بڑے محدث گزرے ہیں "ریاض الصالحین" میں توبہ کے باب میں علمائے اُمت کا اس بات پر

اجماع نقل کیا ہے کہ اگر توبہ کسی ایسے گناہ کے ضمن میں ہو جو حقوق اللہ سے متعلق ہے تو اس کے صحیح ہونے کی تین شرائط ہیں۔ لیکن اگر کوئی گناہ حقوق العباد کے ضمن کا ہے تو ایک اضافی شرط مزید شامل ہو جائے گی۔ پہلی تین شرائط حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں مشترک ہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ انسان کے دل میں سچی اور حقیقی ندامت ہو کہ میں اب تک جو کچھ کرتا رہا ہوں' غلط کرتا رہا ہوں۔ اس پر واقعی پشیمانی ہو۔ اس حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے نوعمری کے دور کے اس شعر میں نہایت خوبصورتی سے بیان کیا ہے' جسے داغ دھلوی نے بہت پسند کیا تھا اور اس پر داد دی تھی کہ ؂

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

تو اللہ کو بندے کی یہ پشیمانی اور ندامت بہت محبوب ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ عزمِ مصمّم ہو کہ اب یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا۔ تیسری شرط یہ ہے کہ فی الواقع اُس گناہ کو ترک کردے اور عمل صالح کی روش اختیار کرے۔ یہ تین شرائط حقوق اللہ کے ضمن کے گناہوں سے متعلق ہیں ـــــ اضافی چوتھی شرط حقوق العباد کے معاملے میں ہے۔ وہ یہ کہ اگر کسی انسان کا حق مارا ہے تو اس کی تلافی کرے' کسی کا مال ہڑپ کیا ہے تو وہ مال واپس کرے یا اُس سے معافی طلب کرے' کسی کی غیبت کی ہے تو اس کے پاس جاکر معافی چاہے' کسی پر ظلم کیا ہے تو اس کے لئے مظلوم سے عفو اور درگزر حاصل کرے۔ اس لئے کہ یہ جو حقوق العباد ہیں انہیں اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اگر اس دنیا میں ان بندوں سے جن کی حق تلفی کی گئی ہے معافی حاصل نہیں کی جائے گی تو آخرت میں نیکیوں اور گناہوں کا لین دین ہوگا۔ یعنی ظلم اور زیادتی کرنے والے شخص کی نیکیاں اس شخص کو دے دی جائیں گی جس کے حق پر اس دنیا میں دست درازی کی گئی تھی یا جس پر ظلم کیا گیا تھا۔ اگر زیادتی کرنے والے کی نیکیوں کا سرمایہ ختم ہو جائے گا تو پھر مظلوم کے گناہ ظالم کے وزن اعمال کے پلڑے میں ڈال دیئے جائیں گے۔

چنانچہ اس آیت پر غور کیجئے' فرمایا : ﴿ اِلَّا مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا ﴾
یہاں صرف ایک لفظ "تَابَ" نہیں آیا' بلکہ اس کے ساتھ ایمان اور عمل صالح کا ذکر بھی ہے۔ توبہ کے معنی ہیں لوٹنا' پلٹنا' رجوع کرنا ــــــ تو فرمایا : ﴿ مَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ ﴾ "جو توبہ کرے اور ایمان لائے"۔ اس کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر وہ پہلے کافر تھا' اب ایمان لا رہا ہے تو وہ بھی کفر سے پلٹنے اور ایمان لانے کے اعتبار سے ان الفاظ مبارکہ کے ذیل میں آ جائے گا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ مسلمان تھا اور مسلمان ہوتے ہوئے بھی گناہ کر رہا تھا تو درحقیقت اس گناہ کی وجہ سے جو قلبی یقین والا ایمان ہے وہ زائل ہو گیا تھا۔ اب جب وہ توبہ کر رہا ہے تو گویا تجدید ایمان کر رہا ہے اور اس کے دل میں از سر نو ایمان داخل ہو رہا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ "جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل سے نکل کر پرندے کے مانند اس کے سر پر منڈلاتا ہے۔ اب اگر وہ توبہ کرتا ہے تو ایمان اس کے دل میں لوٹ آتا ہے"۔ لہٰذا جب دل میں تصدیق قلبی والا اور یقین والا ایمان ہو تو اس کے اثرات لازماً عمل پر مترتب ہوں گے اور وہ درست ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ توبہ کے فوراً بعد ایمان اور عمل صالح کا ذکر کیا گیا۔

پھر اس توبہ' تجدیدِ ایمان اور اعمالِ صالحہ کے مرتبہ اور مقام کا ذکر بایں الفاظِ مبارکہ فرمایا : ﴿ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ﴾ "پس ایسے لوگوں کے نامۂ اعمال میں سے اللہ ان کی برائیوں کو محو فرما کر ان کی جگہ نیکیوں کا اندراج فرما دے گا۔" یہ ہے اللہ کی نگاہ میں توبہ کی عظمت۔ اس آیت کا اختتام ان الفاظ مبارکہ پر ہوتا ہے : ﴿ وَ كَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝ ﴾ "اور اللہ تو ہے ہی بخشنے والا' رحم فرمانے والا" ــــــ اس کی ذات والاصفات میں مغفرت و رحمت کی شانیں بدرجۂ اتم موجود ہیں ــــــ لہٰذا ایک مومن کو کبھی مایوس نہیں ہونا چاہئے۔ گناہ کی معافی کے لئے اس کی رحمت و مغفرت کے دروازے لوگوں کے لئے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں' بشرطیکہ وہ اس کی جناب میں پورے لوازم و شرائط کے ساتھ توبہ کریں۔

اگلی آیت میں اس بات کو پھر دہرایا گیا۔ عمل صالح توبہ کی شرط لازم ہے۔ انسان توبہ توبہ کہتا رہے اور اس کا عمل وہی رہے جو پہلے تھا تو یہ توبہ نہیں ہے' یہ تو اپنے آپ کو

دھوکہ دینا ہے۔ بلکہ فرمایا : ﴿ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّهِ مَتَابًا ۝ ﴾
"جو شخص توبہ کرے اور عمل درست کرے تو وہ ہے کہ جو اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے جیسا کہ توبہ کرنے کا حق ہے۔"

عباد الرحمن کے اوصاف کے ضمن میں اگلی آیات میں فرمایا گیا :

﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَإِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ إِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ۝ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ' حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ۝ ﴾

(الفرقان : ۷۲ تا ۷٦)

"اور وہ لوگ جو جھوٹ میں شرکت گوارا نہیں کرتے اور اگر اتفاقاً کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ وہاں سے اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں' اور وہ جنہیں جب اپنے رب کی آیات کے ذریعے سے تذکیر اور نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے ہو کر گر نہیں پڑتے۔ اور وہ جو کہتے ہیں : اے ہمارے رب! ہمیں عطا فرما ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک' اور ہمیں متقی لوگوں کا امام بنا۔ یہ ہیں وہ لوگ کہ جنہیں بدلے میں دیئے جائیں گے بالاخانے بسبب ان کے صبر کے' اور اُن کا استقبال ہو گا جنت میں دُعا اور سلام کے ساتھ۔ رہیں گے وہ اس میں ہمیشہ ہمیش۔ بہت ہی اچھی ہے وہ جگہ مستقل جائے قرار ہونے کے اعتبار سے بھی' اور تھوڑی دیر قیام کے لئے بھی۔"

سورۃ الفرقان کی مندرجہ بالا آیات میں پھر وہی مضمون آیا ہے جو اس سے پہلے اس رکوع کی تیسری آیت سے لے کر آٹھویں آیت تک آیا تھا۔ یعنی اللہ کے محبوب بندوں کے اوصاف۔ گویا وہ اوصاف جو اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہیں۔ اس رکوع کی تیسری سے آٹھویں آیت تک چھ اوصاف کا ذکر ہو چکا ہے' جن میں سے پہلا وصف تواضع ہے یعنی وہ لوگ جو زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں' ان کی چال سے عجز و انکسار اور تواضع کا اظہار

ہو تا ہے۔ دوسری صفت خواہ مخواہ کی بحث و تمحیص سے دامن بچانا ہے۔ اللہ کے ان محبوب بندوں سے جب مشتعل مزاج لوگ خواہ مخواہ حجت بازی پر اتر آتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر ان سے جدا ہو جاتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ شب کی عبادت میں اللہ کے محبوب بندے اپنی راتیں اللہ کے حضور سجدے اور قیام میں گزارتے ہیں : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴾ چوتھی صفت جہنم سے پناہ مانگتے رہنا بیان ہوئی' کہ اے رب ہمارے! ہمیں عذاب جہنم سے بچالے۔ ان کی پانچویں صفت میانہ روی ہے' بالخصوص خرچ کے معاملہ میں : ﴿ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴾ چھٹی صفت کبیرہ گناہوں سے بچتے رہنا' جس کا ذکر سورۃ الشوریٰ اور سورۃ النجم میں بایں الفاظ مبارکہ آیا ہے : ﴿ وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ ﴾ "وہ لوگ جو بڑے بڑے گناہوں اور فحش کاموں سے بالفعل مجتنب رہتے ہیں"۔ اور ہم کئی مرتبہ دیکھ چکے ہیں کہ از روئے قرآن مجید کبیرہ گناہوں میں سب سے بڑے اور چوٹی کے گناہ تین ہیں : شرک' قتل ناحق اور زنا۔

ان چھ اوصاف کے ذکر کے بعد ایک ضمنی بحث توبہ کی عظمت' توبہ کی حقیقت' توبہ کی اہمیت اور توبہ کی شرائط کے بارے میں آگئی تھی۔ اب مضمون پھر اسی سلسلہ گفتگو کی طرف لوٹ رہا ہے یعنی عباد الرحمٰن کے اوصاف کیا کیا ہوتے ہیں۔

یہاں پہلا وصف بیان ہوا : ﴿ وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ﴾ زُور جھوٹ کو کہتے ہیں اور شَہِدَ یَشْہَدُ کا معنی موجود ہوتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ جھوٹ پر اپنی موجودگی بھی گوارا نہیں کرتے۔ کہیں جھوٹ کا معاملہ ہو رہا ہو' کہیں جھوٹ کی بنیاد پر لین دین ہو رہا ہو' کہیں کوئی سازش ہو رہی ہو' کہیں کچھ جھوٹ گھڑے جا رہے ہوں تو ایسی جگہوں پر انہیں اپنی موجودگی تک گوارا نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ جھوٹی گواہی اس میں از خود آجائے گی۔ جو لوگ جھوٹ میں ادنیٰ درجہ کی شرکت اور شمولیت گوارا نہیں کرتے' وہ جھوٹی گواہی کیونکر دیں گے؟

دوسرا وصف ہے : ﴿ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ۝ ﴾ یعنی وہ لوگ کہ جن کا

کسی لغو اور بیکار کام کی طرف قصد اور ارادہ کر کے جانا تو سرے سے خارج از بحث ہے ہی، اگر کسی لغو کام پر ان کا اتفاقاً گزر ہو جائے، مثلاً راہ چلتے ہوئے جب دیکھیں کہ کوئی مداری تماشا دکھا رہا ہے تب بھی یہ لوگ اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، بلکہ اپنے دامن کو بچاتے ہوئے وہاں سے گزر جاتے ہیں۔ یہ مضمون اس سے پہلے سورۃ المومنون کی ابتدائی آیات میں آ چکا ہے : ﴿ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴾ لیکن یہاں جو فرق ہے اسے نوٹ کر لیجئے کہ ایک ہے لغو کام کا ارادہ کرنا۔ لیکن یہاں نقشہ یہ کھینچا گیا ہے کہ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ اللہ کے یہ محبوب بندے کوئی لغو اور بے کار کام کریں۔ اگر اتفاقاً بھی کسی لغو کام پر ان کا گزر ہو جائے تو وہ باعزت طور پر اپنا دامن بچاتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اصل میں مومن کو اپنے وقت کی قدر ہوتی ہے۔ یہ محدود سا وقت اور محدود سی فرصت جو اِس دنیا میں حاصل ہے یہ بڑی قیمتی ہے۔ اس لئے کہ اِس کے نتائج اُس دنیا میں نکلیں گے جو لامحدود ہے۔ لہٰذا نتیجہ کے اعتبار سے اس زندگی کا ہر لحہ امر ہے۔ اس کا ثمرہ اُس زندگی میں ملے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے۔ لہٰذا ان کے پاس کوئی فالتو وقت نہیں ہوتا کہ اُسے بیکار کاموں میں صرف کریں۔

تیسرا وصف یہ بیان ہوا کہ جب انہیں ان کے رب کی آیات کے ذریعہ سے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے بہرے ہو کر نہیں گر پڑتے : ﴿ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ﴾ اس میں کفار کی طرف ایک تعریض ہے کہ انہیں جب آیات الٰہی سنائی جاتی ہیں تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ جیسے وہ ان کی مخالفت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ وہ غور ہی نہیں کرتے، سنتے ہی نہیں، تدبّر ہی نہیں کرتے۔ پہلے ہی سے طے کئے بیٹھے ہوتے ہیں کہ اعتراضات وارد کریں۔ یہ معاملہ مذکورہ بالا اوصاف کے حامل عباد الرحمٰن کا نہیں ہوتا ہے۔ اس قدر (value) کو اگر ہم مثبت طور پر معین کریں تو وہ یہ ہوگی کہ آیاتِ قرآنیہ پر، آیاتِ ربانیہ پر تدبّر و تفکّر ہو، ان پر غور کیا جائے، انہیں گوشِ حقیقت نیوش سے سنا جائے۔ انسان ان آیاتِ الٰہیہ کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرے۔

چوتھا وصف انسانی فطرت سے وابستہ ہے۔ جو شخص خود نیک ہوگا اور سیدھے راستہ پر زندگی بسر کر رہا ہوگا، لازماً اس کی تمنا ہوگی کہ اس کے اہل و عیال بھی اسی راستہ پر چلیں،

اور وہ بھی تقویٰ اور احسان کی روش اختیار کریں۔ لہٰذا وہ اپنے رب سے دُعا کرتے رہتے ہیں کہ : ﴿ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَ ذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ ﴾ "اے ہمارے رب ' ہمیں اپنی بیویوں سے اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما۔" ایک مومن کی آنکھوں کی ٹھنڈک اسی میں ہے کہ اُس کی اولاد بھی ایمان و اسلام اور تقویٰ و احسان کے راستہ پر گامزن ہو ' اس کے گھر میں بِرّ و تقویٰ کا ماحول ہو۔ چنانچہ اس معاملے میں ہمارے قریب کے زمانہ میں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی مثال بڑی عظیم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں چار بیٹے عطا فرمائے ' شاہ عبدالقادر ' شاہ عبدالعزیز ' شاہ عبدالغنی ' اور شاہ رفیع الدین رحمہم اللہ۔ یہ چاروں نہایت نیک اور نہایت پارسا تھے۔ ان میں سے دو بیٹے تو وہ ہیں (یعنی شاہ عبدالقادر اور شاہ رفیع الدین) جنہوں نے قرآن مجید کے اردو میں اولین ترجمے کئے اور آج تک مستند ترین ترجمے وہی ہیں۔ تیسرے بیٹے نے دہلی میں درس گاہ قائم کی جو مدرسہ شاہ عبدالعزیز کے نام سے مشہور ہے جس سے برِّ عظیم پاک و ہند میں بہت علم پھیلا۔ جبکہ چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی کا نوجوانی ہی میں انتقال ہو گیا تھا ' لہٰذا کسی علمی میدان میں ان کی صلاحیتیں زیادہ نمایاں نہیں ہو سکیں۔ تاہم اس کی تلافی اللہ تعالیٰ نے اس طرح فرمادی کہ آگے ان کے بیٹے شاہ اسماعیل شہیدؒ تھے ' اور ان کا نام اپنے اس نامور عالم و مجاہد اور شہید بیٹے کی وجہ سے روشن ہوا۔ تو آپ غور کیجئے کہ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کو اپنی اولاد کو ان کیفیات میں دیکھ کر کس قدر آنکھوں کی ٹھنڈک میسر آتی ہو گی!

اس کے بعد فرمایا : ﴿ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴾ اور وہ یہ دُعا بھی کرتے ہیں کہ "ہمیں متقیوں کا امام بنادے"۔ ان الفاظ سے یہ مضمون بھی متبادر ہو سکتا ہے کہ یہ دُعا کی جارہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں نیک لوگوں کا امام اور پیشوا بنائے ' نیک لوگوں کے آگے چلنے والا بنائے۔ اگرچہ اس کی خواہش رکھنا بھی کوئی بری بات نہیں ہے ' لیکن جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آرہے ہیں ' اس کے اعتبار سے ان کا مفہوم کچھ دوسرا ہے۔ درحقیقت ان الفاظ کے ذریعے پہلی بات ہی کی مزید تاکید ہو رہی ہے۔ اس لئے کہ ہر شخص فطری طور پر اپنے اہل و عیال کا امام ہے۔ قیامت کے روز جب لوگ اُٹھیں گے تو ان کے پیچھے ان کی

نسلیں چلی آ رہی ہوں گی' ان کی اولاد و اَخلاف ان کے پیچھے چلے آ رہے ہوں گے۔ تو گویا وہی بات ذرا اسلوب بدل کر کہی گئی ہے کہ اے رب ہم جن کے امام ہیں' ان کو متقی بنا دے۔ ایسا نہ ہو کہ ہمارے پیچھے آنے والے' ہماری آئندہ نسلیں فُسّاق و فُجّار پر مشتمل ہوں۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے : ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَّکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) یعنی "تم میں سے ہر ایک کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے اور تم میں سے ہر ایک اپنے ریوڑ کے بارے میں جواب دہ ہے"۔ جیسے بھیڑ بکریاں چرانے والا ایک چرواہا ہوتا ہے اور چند بھیڑ بکریاں اس کی ذمہ داری ہوتی ہیں' شام کو اگر کوئی بھیڑ یا بکری لوٹ کر نہ آئی تو اُس سے پوچھا جائے گا' وہ ان کے بارے میں مسئول ہے۔ اسی طرح تم میں سے ہر شخص کی حیثیت ایک چرواہے کی ہے' اللہ نے اپنی مخلوق میں سے کچھ افراد تمہارے حوالے کر دیئے ہیں' وہ تمہاری بیویاں ہیں' تمہاری اولاد ہیں' وہ تمہارے زیر کفالت ہیں' وہ تمہارے زیر تربیت ہیں' یہ تمہارا وہ گلہ ہے جس کے بارے میں اللہ تم سے پوچھے گا کہ تم نے ان کی صحیح رخ پر تعلیم و تربیت کا کتنا اہتمام کیا؟ انہیں اللہ کے نیک اور متقی بندے بنانے کے لئے کتنی محنت کی؟ یہ ہے مفہوم اس ارشاد نبویؐ کا ((کُلُّکُمْ رَاعٍ وَکُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ)) چنانچہ ہر بندۂ مومن کی یہ دُعا ہونی چاہئے کہ اے اللہ' جو گلّہ تو نے مجھے عطا فرمایا ہے' جس کی ذمّہ داری تو نے مجھے سونپی ہے' اس کو توفیق دے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کی روش اختیار کرے' اور ہم کو ایسے متقیوں کا امام بنا: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴾

آگے فرمایا: ﴿اُولٰٓئِکَ یُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا﴾ "یہ وہ لوگ ہیں جنہیں جزا کے طور پر جنت میں بالاخانے ملیں گے بسبب ان کے صبر کے"۔ اس آیت میں گویا عباد الرحمٰن کا چھٹا اور نہایت اہم وصف آ گیا۔ بِمَا صَبَرُوْا' یعنی یہ درحقیقت بدلہ ہے اُس صبر کا جو انہوں نے اللہ کی راہ میں کیا۔ یہ وہ بات ہے جو ہم سورۃ العصر کے ذیل میں بھی پڑھ چکے ہیں اور سورۃ لقمان کے دوسرے رکوع میں بھی کہ ﴿وَاصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ﴾ ظاہر بات ہے کہ یہ تمام اوصاف انہی لوگوں میں پیدا ہو سکتے ہیں جن میں صبر کا مادہ ہو' تبھی وہ دنیوی

لذات و ترغیبات سے کنارہ کشی کر سکیں گے، ہوائے نفس سے اجتناب کر سکیں گے، اور شیطان کے اغوا سے بچ سکیں گے۔ یہ سب کام اُسی وقت ممکن ہوں گے جب ان میں صبر کا مادہ ہو گا۔ پھر دنیا میں نیکی، راست بازی اور صداقت شعاری کا راستہ اختیار کرنے والوں کو آزمائشوں سے سابقہ پیش آکر رہے گا۔ ان آزمائشوں پر صبر کر کے ہی وہ بر و تقویٰ کی راہ پر مستقیم رہ سکیں گے۔ جیسے سورۃ حم السجدہ کی آیات میں ہم نے پڑھا تھا: ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا﴾ تو یہ استقامت اور یہ صبر ہی در حقیقت وہ جوہر ہے کہ جس کی بنیاد پر انسان دنیا میں وہ روش اختیار کر سکتا ہے جس کے نتیجے میں اس میں وہ اوصاف پیدا ہو سکتے ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا ـــــ اس آیت کا اختتام ان الفاظ پر ہوتا ہے کہ : ﴿وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً وَّسَلٰمًا﴾ "ان لوگوں کا جنت میں استقبال ہو گا دعاؤں کے ساتھ اور سلام کے ساتھ"۔ ظاہر بات ہے کہ یہ استقبال کرنے والے جنت کے فرشتے ہوں گے۔

آگے فرمایا: ﴿خٰلِدِيْنَ فِيْهَا﴾ "اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے"۔ جنت وہ جگہ ہے کہ ایک بار داخلے کے بعد وہاں سے نکلنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ ﴿حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا﴾ "وہ جنت بہت ہی عمدہ جگہ ہے مستقل رہنے کے لئے بھی اور تھوڑی سی دیر کے قیام کے لئے بھی"۔ اس رکوع میں پہلے جہنم کا ذکر آیا تھا، اب یہاں جنت کا ذکر تقابل (contrast) کے طور پر آیا ہے۔ کیونکہ دنیا میں ہمارا تصور یہ ہے کہ کتنی ہی عمدہ جگہ پر بھی اگر مستقل رہنا پڑے تو اُس میں انسان کے لئے کوئی دلچسپی اور رعنائی نہیں رہتی اور اگر بُری سے بُری جگہ پر بھی تھوڑی سی مدت کے لئے جانا ہو، جیسے صحرائے اعظم میں انسان تھوڑے عرصہ کے لئے چلا جائے تو تبدیلی (change) کی وجہ سے ایک تفریح ہو جاتی ہے، ایک مہم جوئی کا احساس ہوتا ہے۔ تو جہنم کے بارے میں فرمایا کہ وہ ایسی بُری جگہ ہے کہ مستقل جائے قرار کی حیثیت سے تو انتہائی خوفناک ہے ہی، اگر کوئی ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں داخل کر دیا جائے تو اس دوزخ کی تمام شدّتیں، غلظتیں اور ساری کلفتیں آنِ واحد میں عیاں ہو جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جنت وہ جگہ ہے کہ وہاں تھوڑی دیر ہی نہیں بلکہ مستقل قیام ہو گا، لیکن اس کے حسن میں، اس کی رعنائیوں میں، اس کی دلچسپیوں

میں کبھی کوئی کمی نہیں آئے گی اور انسان اس سے کبھی بھی نہیں اکتائے گا۔

آخر میں ارشاد فرمایا :

﴿ قُلْ مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّىْ لَوْ لَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا۝ ﴾ (الفرقان : ۷۷)

"(اے نبی ﷺ)! فرمادیجئے : میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے اگر نہ ہوتا تمہارا پکارنا' سو تم جھٹلا چکے ہو' اب اس کی سزا جلد ہی تمہیں چمٹ کر رہے گی۔"

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اور اس سورۂ مبارکہ کی پہلی آیت میں بڑا گہرا ربط و تعلق ہے۔ پہلی آیت مبارکہ ہے :

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا۝ ﴾

"بڑی بابرکت ہے وہ ہستی جس نے نازل فرمایا الفرقان اپنے بندے پر تاکہ وہ تمام جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن جائیں۔"

ایمانیات کے ذیل میں یہ بات ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ایمان کے تین بڑے بڑے اجزاء ہیں : (۱) ایمان باللہ یا توحید' (۲) ایمان بالآخرۃ یا معاد' اور (۳) ایمان بالرّسالت۔ سورۃ الفرقان کے آخری رکوع کی پہلی دو آیات ایمان باللہ سے بحث کرتی ہیں۔ فرمایا گیا : ﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ جَعَلَ فِى السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا۝ وَهُوَ الَّذِىْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا۝ ﴾ میں نے عرض کیا تھا کہ ان سب کا نتیجہ ایمان باللہ ہے۔ سورۃ الفرقان کی پہلی اور آخری آیت کا تعلق ایمان بالرسالت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ رسولوں کو کیوں بھیجتا رہا! نبوت و رسالت کی غرض و غایت کیا ہے! سورۃ النساء کی آیت ۱۶۵ میں یہ مضمون بڑی وضاحت سے اور بڑے واضح الفاظ میں آیا ہے۔ فرمایا :

﴿ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۝ ﴾

"ہم اپنے رسولوں کو بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجتے رہے ہیں
تاکہ رسولوں کی آمد کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے یہاں کوئی عذر باقی نہ رہ
جائے۔ اور اللہ تو ہے ہی غالب ' حکمت والا۔"

معلوم ہوا کہ رسولوں کو بھیجنے کا ایک اہم مقصد "اتمامِ حجت" اور "قطعِ عذر" تھا تاکہ لوگ یہ نہ کہہ سکیں کہ اے اللہ! ہمیں پتہ نہیں تھا کہ تو کیا چاہتا ہے! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ تجھے کون کون سے اوصاف پسند ہیں! ہم جانتے نہیں تھے کہ تو کن چیزوں سے ناراض ہوتا ہے! اگرچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں سماعت و بصارت ' عقل و شعور اور نیکی و بدی کی تمیز جیسی بہت سی چیزوں سے مسلح کر کے بھیجا ہے اور یہ بنیادی اور ابتدائی حجت ہے جو ہر انسان پر قائم ہے ' لیکن اتمامِ حجت تب ہوتا ہے جب رسول تشریف لاتے ہیں۔ چنانچہ رسولوں نے حق کو قولاً اور عملاً پیش کر دیا۔ سچ بولنے کی ترغیب دی تو ساری عمر سچ بول کر دکھایا۔ دیانت اور امانت کی تلقین کی تو اپنی زندگیوں میں دیانت و امانت کا نمونہ پیش فرمادیا۔ عدل و قسط کی تاکید کی تو دوست و دشمن کی تمیز و امتیاز کے بغیر عدل و انصاف کر کے دکھایا۔ عفو و صفح کی نصیحت کی تو اپنے جان کے دشمنوں ' اور خود اپنے اوپر اور اپنے ساتھیوں پر بے پناہ مظالم ڈھانے والوں کو معاف کر کے دکھایا۔ جو دعوت دی اس کا عملی نمونہ بھی لوگوں کے سامنے رکھ دیا۔ تو گویا لوگوں پر قولاً اور عملاً آخری درجہ میں حجت قائم ہو گئی۔ یہی وہ حقیقت ہے جو سورۃ النساء کی مذکورہ بالا آیت میں بیان فرمائی گئی ہے۔

یہی مضمون سورۃ الفرقان کی پہلی آیت میں آیا ہے کہ انبیاء و رُسل کی اس مقدس جماعت میں حضور ﷺ کی ایک امتیازی شان ہے۔ پہلے بھی رسول بشیر و نذیر بن کر آتے تھے لیکن وہ اپنی اپنی قوموں کی طرف آتے تھے۔ قرآن مجید میں یہ مضمون تکرار کے ساتھ آیا ہے : وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًا.... وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا.... اور وَاِلٰی مَدْیَنَ اَخَاھُمْ شُعَیْبًا○ "قومِ عاد کی طرف ہم نے ان کے بھائی ہود کو بھیجا.... قومِ ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح کو بھیجا.... اور ہم نے مدین (میں رہنے والی قوم) کی طرف ان کے بھائی شعیب کو بھیجا....." چنانچہ مطالعہ قرآن حکیم کی روشنی میں یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ نبی اکرم ﷺ کی بعثت سے قبل نبوت اور رسالت کا معاملہ علاقائی یا قومی ہوتا تھا ' لیکن جناب

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر جو نبوت کا اختتام و اتمام ہوا اور رسالت کی تکمیل ہوئی' اس کا ایک مظہر یہ ہے کہ حضور ﷺ سارے جہان والوں کے لئے خبردار کرنے والے بن کر تشریف لائے اور قرآن مجید' فرقان حمید اسی مقصد کے لئے نازل فرمایا گیا :

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِىْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا ۝ ﴾

یہی بات سورۃ الانبیاء میں بایں الفاظِ مبارکہ فرمائی گئی : ﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ اور سورۂ سبا میں حضور ﷺ کی آفاقی و عالمی شان کو اور بھی واضح الفاظ میں بیان فرمایا گیا :

﴿ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ﴾

"اور (اے نبیؐ) ہم نے نہیں بھیجا آپ کو مگر تمام لوگوں کے لئے بشیر اور نذیر بنا کر!"

لیکن یہ بات جان لیجئے کہ رسول ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے برہان' دلیل اور بیّنہ بن کر تشریف لاتے ہیں' لہٰذا جہاں رسولوں کی بعثت رحمت ہے وہاں جو انکار کرنے والے ہیں ان کے لئے دنیا اور آخرت میں یہی چیز موجب عذاب اور موجب سزا بھی ہے۔ رسولوں کی آمد سے پہلے ان کے پاس کوئی عذر تو تھا کہ اے اللہ' ہمیں معلوم نہیں تھا' ہم جانتے نہیں تھے کہ تیری رضا کیا ہے۔ لیکن رسولوں کے آنے کے بعد یہ عذر ختم ہو گیا۔ اب محاسبہ شدید ہو گا اور پکڑ سخت ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید میں بار بار اُن قوموں کا ذکر ہوا ہے جن کی طرف رسولوں کو مبعوث فرمایا گیا' اور جب انہوں نے ان رسولوں کا انکار کیا' ان کی تکذیب کی' ان کو قتل کرنے کے درپے ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کو اور اُن چند لوگوں کو جو ان رسولوں پر ایمان لائے تھے بچا لیا' اور اُن قوموں کو ہلاک کر دیا۔ سورۃ الفرقان کی اس آخری آیت میں اہل عرب کو یہی تنبیہہ فرمائی جا رہی ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ ہمارے رسول اگر تمہیں دعوت دے رہے ہیں' تبلیغ کر رہے ہیں' تمہارے پیچھے پیچھے پھر رہے ہیں' ایک ایک گھر پر جا کر پیغام ربانی پہنچا رہے ہیں' ایک ایک انسان کے دل پر دستک دے رہے ہیں تو میرے رب کو تمہاری کوئی پروا ہے۔ اللہ کو ہرگز تمہاری کوئی پروا نہیں ہے۔ اگر تمہیں پکارنا اور خبردار کرنا مقصود نہ ہوتا تو

ہمارے رسول یہ مشقت نہ جھیلتے۔ اس لئے کہ سنّت اللہ یہی ہے کہ کسی قوم پر عذاب بھیجنے سے پہلے اُسے متنبّہ اور خبردار کردیا جائے' جیسا کہ سورۂ بنی اسرائیل میں فرمایا :

﴿ وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا ۝ ﴾

"ہم عذاب نہیں بھیجتے رہے ہیں جب تک رسولوں کو مبعوث نہ فرمادیں۔"

یعنی رسولوں کی آمد کے ذریعے جب تک اتمامِ حجت نہ ہو جائے' اس سے پہلے قومیں ہلاک نہیں کی جاتیں۔ لہٰذا یہاں نبی اکرم ﷺ سے کہلوایا جارہا ہے کہ میں نے تم تک تمہارے رب کا پیغام پہنچادیا' تمہارے سامنے تمہارے رب کی دعوت پیش کردی۔ مجھ تک جو ہدایت ربانی آئی تھی' اسے قولاً اور عملاً تمہارے سامنے پیش کردیا۔ یہ تمہارے ہی نفع کے لئے کیا گیا ہے' ورنہ میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے ﴿مَا يَعْبَؤُا بِكُمْ رَبِّیْ﴾ یہ تبلیغ و دعوت اس لئے ہے کہ تم کو خبردار کردیا جائے۔ اگر تمہیں پکارنا نہ ہوتا ﴿لَوْلَا دُعَاؤُكُمْ﴾ تو رشد وہدایت اور دعوت و تبلیغ کی ذمہ داری بھی مجھ پر نہ ہوتی ـــــ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ "پس تم جھٹلا چکے' تم تکذیب کرچکے"۔ عربی زبان میں فعل ماضی پر جب "قَدْ" کا اضافہ ہو جاتا ہے تو اس میں کسی کام کے ہو جانے میں قطعیت و حتمیت کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ انگریزی میں Present Perfect Tense کا جو مفہوم ہوتا ہے' یعنی کام ہو چکا ہے' بات ہو چکی ہے' یہی مفہوم عربی میں فعل ماضی پر "قَدْ" کا اضافہ کرنے سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ فرمایا : ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ سو لوگو' تم جھٹلا چکے ہو۔ اب عنقریب اس کی پکڑ آکے رہے گی ﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝﴾ لازم وملزوم کے الفاظ ہم عام بول چال میں استعمال کرتے ہیں۔ لِزَامًا کے معنی ہوں گے جسے کوئی چیز چمٹ کر رہ جائے' چپک کر رہ جائے۔ تو فرمایا : ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ۝﴾ "سو تم نے (دعوتِ ربانی کو) جھٹلادیا' پس عنقریب اس کا وبال تم پر لاگو ہو کر رہے گا۔" تمہیں اس تکذیب کی سزا مل کر رہے گی۔

یہ آیتِ مبارکہ نہ صرف اُن لوگوں کے لئے بہت اہم ہے جو قرآن مجید کے اولین مخاطب تھے اور جن کے سامنے جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ بنفس نفیس خلقِ خدا کو دعوت پہنچا رہے تھے بلکہ ہمارے لئے بھی بہت اہم ہے۔ اس لئے کہ جناب محمدٌ رسول اللہ ﷺ پر

نبوت کا جو اختتام و اتمام ہوا ہے، رسالت کی جو تکمیل ہوئی ہے، اس کا ایک مظہر وہ ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ حضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی کے لئے ہے۔ اور اسی کا دوسرا مظہر یہ ہے کہ آپ ﷺ ہی کا دورِ رسالت تاقیامِ قیامت جاری ہے۔ یہ دَور جس میں ہم سانس لے رہے ہیں، یہ بھی دورِ رسالتِ محمدی ہے (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام)۔ ہر انسان جو آج دنیا میں پیدا ہو رہا ہے اور قیامت تک پیدا ہو گا وہ نبی آخر الزماں ﷺ کی اُمّتِ دعوت میں شامل ہے۔ ہاں اُمّتِ اجابت میں وہی شامل ہو گا جو نبی اکرم ﷺ کی دعوت پر لبیک کہے، حضورؐ کی تصدیق کرے، حضورؐ پر ایمان لائے۔ لیکن امتِ دعوت سے مُراد وہ تمام لوگ ہیں جن کی طرف کسی رسول کو بھیجا گیا ہو۔ جیسے حضرت ہود علیہ السلام کی امت دعوت قوم عاد تھی، حضرت صالح علیہ السلام کی اُمت دعوت قوم ثمود تھی، اسی طرح جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی امت دعوت پوری نوعِ انسانی ہے۔ اور پیغامِ ربانی کو جس طرح نبی اکرم ﷺ نے بنفسِ نفیس اُن لوگوں کو پہنچایا جو آپؐ کے مخاطبینِ اولین تھے، اسی طرح یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم روئے ارضی پر بسنے والے ہر شخص تک اسے پہنچائیں۔ حضورؐ نے تکلیفیں جھیل کر اور مصیبتیں اٹھا کر یہ فریضۂ دعوت انجام دیا۔ آپؐ کا تمسخر و استہزاء بھی ہوا، آپؐ پر پتھراؤ بھی ہوا، آپؐ کے راستہ میں کانٹے بھی بچھائے گئے، آپؐ کی گردن مبارک میں چادر ڈال کر اس طرح بل دیا گیا کہ چشم ہائے مبارک اُبل پڑنے کو ہوئیں۔ آپؐ پر کوڑا کرکٹ ڈالا گیا۔ آپؐ کے شانۂ مبارک پر، جبکہ آپؐ سربسجود تھے، اونٹ کی نجاست بھری اوجھڑی رکھی گئی۔ طائف کی گلیوں میں آپؐ پر پتھروں کی اس طور پر بارش ہوئی کہ جسد اطہر لہولہان ہو گیا اور جسم سے خون اقدس بہہ بہہ کر نعلین شریف میں جم گیا۔ یہ ساری تکلیفیں آپ ﷺ نے جھیلیں، لیکن دین کا پیغام پہنچا کر حجت قائم کر دی۔

اب یہ کام اُمّتِ مسلمہ کے ذمہ ہے، میرے اور آپ کے ذمہ ہے، حضور ﷺ کے ہر اُمتی کے ذمہ ہے کہ اللہ کا پیغام ایک ایک فردِ نوعِ بشر تک پہنچائیں۔ یہ ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ اگر پہنچا دیں تو ہم بریٔ الذمہ ہو جائیں گے۔ جن تک بات پہنچا دی جائے اگر وہ دعوت کو رد کریں اور اُس کو قبول کرنے سے انکار کریں تو پھر وہ ذمہ دار

ہوں گے' سارا بوجھ ان پر آئے گا۔ لیکن اگر معاملہ وہ ہو جو فی الواقع ہمارا ہے کہ ہم دوسروں تک کیا پہنچائیں آج خود ہم اس بات کے محتاج ہو گئے ہیں کہ قرآن ہمیں پہنچایا جائے تو مجرم ہم ٹھہریں گے۔ سو معلوم ہوا کہ ہمارے شانوں پر دوہری ذمہ داری آ گئی۔ جن تک پیغام پہنچانا تھا اگر ان تک پیغام نہیں پہنچ رہا' انذار نہیں ہو رہا' دعوتِ ربانی کا حق ادا نہیں ہو رہا' تو ان لوگوں کی غلط روی اور گمراہی کا وبال بھی ہم پر آئے گا۔ اور خود ہمارا اپنا حال یہ ہے کہ اگرچہ ہم قرآن کے ماننے والے ہیں اور جناب محمد رسول اللہ ﷺ کے نام لیوا ہیں' لیکن اِلّاماشاء اللہ' ہم عملاً تو تکذیب کر رہے ہیں۔ ایک تکذیب قولی ہوتی ہے کہ کسی نبی کے بارے میں یہ کہا جائے کہ وہ نبوت کا غلط دعویٰ کر رہا ہے' جھوٹ گھڑ رہا ہے۔ جیسے ابوجہل اور ابولہب نے حضور ﷺ کی تکذیب کی ـــــ جبکہ ایک تکذیب عملی ہوتی ہے کہ بظاہر زبان سے حضورؐ کو نبی اور رسول مان لیا جائے' لیکن آپؐ کے احکام کو تسلیم نہ کیا جائے۔ تکذیبِ عملی کی ایک مثال قرآن مجید میں سورۃ الجمعہ میں آئی ہے :

﴿ مَثَلُ الَّذِیْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰىةَ ثُمَّ لَمْ یَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ۭ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ ○ ﴾

"مثال ان کی جو حامل تورات بنائے گئے تھے' پھر انہوں نے اس کی ذمہ داری کو ادا نہ کیا' اُس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابوں کا بوجھ لدا ہوا ہو' اور بہت بری ہے مثال اُس قوم کی جس نے آیاتِ الٰہیہ کی تکذیب کی۔ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔"

اب آپ اِس آیت مبارکہ کے ان الفاظ پر غور فرمائیے : ﴿ بِئْسَ مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ ﴾ ہم سب جانتے ہیں کہ یہود نے زبان سے کبھی تورات کی تکذیب نہیں کی۔ تو غور طلب بات یہ ہے کہ یہ تکذیب کون سی ہے! ـــــ یہ تکذیب درحقیقت تکذیبِ عملی ہے کہ تورات کے کتاب اللہ ہونے کا زبانی اقرار تو موجود ہے لیکن اُس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اور ظاہر بات ہے کہ تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنے والے اگر اُس کے اَحکام پر کاربند نہیں ہیں' اگر تورات کے نواہی سے اجتناب نہیں کیا جا رہا' جو

ذمہ داریاں تورات نے عائد کی ہیں اگر انہیں ادا کرنے سے پہلو تہی کی جا رہی ہے' اُن سے اغماض برتا جا رہا ہے تو چاہے زبان سے یہود اقرار کرتے ہوں کہ وہ تورات کو اللہ کی کتاب مانتے ہیں لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ رویہ تورات کی تکذیب کے مترادف ہے۔ آج اگر ہم اپنے گریبانوں میں جھانکیں تو نظر آئے گا کہ بعینہٖ یہی معاملہ ہمارا ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں پہلے ہی سے متنبہ فرما دیا تھا۔ بڑی پیاری حدیث ہے جس کا آغاز "یَا اَہْلَ الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یعنی "اے قرآن والو!" جیسے قرآن مجید میں یہود و نصاریٰ سے "یَا اَہْلَ الْکِتٰبِ" کے الفاظ سے خطاب ہوتا ہے' محبوبِ ربّ العالمین ﷺ ہم مسلمانوں سے خطاب فرما رہے ہیں "یَا اَہْلَ الْقُرْآنِ" کے الفاظ سے ـــــ ارشاد ہوتا ہے : ((یَا اَہْلَ الْقُرْآنِ لَا تَتَوَسَّدُوا الْقُرْآنَ)) "اے قرآن والو! قرآن حکیم کو اپنا تکیہ نہ بنالینا" اُسے ایک ذہنی سہارا نہ بنالینا۔ قرآن کو پس پشت نہ ڈال دینا ۔ تکیہ پیٹھ کے پیچھے ہوتا ہے' ایسا نہ ہو کہ تم قرآن کو پیٹھ کے پیچھے پھینک دو۔ بلکہ تمہارا طرز عمل کیا ہونا چاہئے : ((وَاتْلُوْہُ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ مِنْ آنَاءِ اللَّیْلِ وَالنَّھَارِ)) "اُسے پڑھو جیسا کہ اُس کے پڑھنے کا حق ہے' رات کے اوقات میں بھی اور دن کے اوقات میں بھی"۔ ((وَافْشُوْہُ)) "اسے پھیلاؤ" اُسے عام کرو' اس کی تبلیغ کرو' اس کے نور سے چہار دانگِ عالم کو منور کرو۔ ((وَتَغَنَّوْہُ)) "اور اُسے خوش الحانی سے پڑھو" کہ اس سے تمہاری روح کو غذا میسر آئے۔ ((وَتَدَبَّرُوا فِیْہِ)) "اور اس میں تدبّر کرو' غور و فکر کرو"۔ وہی بات جو ہم نے اس رکوع میں پڑھی کہ ﴿ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ۝ ﴾ چنانچہ قرآن پر تدبر ہو' غور و فکر ہو۔ آخر میں ارشاد فرمایا : ((لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ)) "تاکہ تم فلاح پاؤ"۔

پس اگر ہم قرآن مجید کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار نہیں کرتے جس کا حکم نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث میں آیا ہے تو چاہے زبان سے ہم مانتے ہوں کہ یہ اللہ کا کلام ہے' لیکن حقیقتاً ہم تکذیب کا ارتکاب کر رہے ہوتے ہیں۔ اور یہی عملی تکذیب ہے۔ اس معنی میں اس آیت مبارکہ کے مخاطبین میں ہم بھی شامل ہیں : ﴿ قُلْ مَا یَعْبَؤُا بِکُمْ رَبِّیْ لَوْلَا

دُعَاؤُكُمْ ﴾ اے نبیؐ! ان لوگوں کے کان کھول دیجئے' انہیں یہ بات سنا دیجئے کہ میرے رب کو تمہاری کوئی پروا نہیں ہے' بلکہ اس نے اگر مجھے مبعوث فرمایا ہے' مجھ پر یہ قرآن نازل فرمایا ہے تو صرف اس لئے کہ تم پر اتمامِ حجت کرنا مقصود ہے۔ لہٰذا میں نے تو تبلیغ کا حق ادا کر کے تم پر حجت قائم کر دی ہے۔ لیکن ﴿فَقَدْ كَذَّبْتُمْ﴾ تم جھٹلا چکے ہو' تم نے کفر کی روش اختیار کی ہے ـــــ خواہ یہ جھٹلانا قولاً ہو یا عملاً ہو ـــــ ﴿فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا﴾ پس جان رکھو کہ جلد ہی اس کی سزا تم سے چمٹ کر رہے گی۔ اس کی پاداش تم کو بھگتنی پڑے گی۔ اللہ تعالیٰ اس انجامِ بد سے ہمیں بچائے۔

بَارَكَ اللّٰهُ لِي وَلَكُمْ فِي الْقُرْآنِ الْعَظِيْمِ'
وَنَفَعَنِيْ وَإِيَّاكُمْ بِالْآيَاتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ○○

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاهور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان — اور — **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ — اور — **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ